لکھنؤ کی زبان
اسکی ساخت و ساخت، نشو و ارتقا، معیار، فصاحت و بلاغت
فلسفۂ لسان اور تاریخ کی روشنی میں
محمد باقر شمس

دار التصنیف کی چوتھی پیشکش

لکھنؤ کی زبان

دوسرا ایڈیشن

تازہ رکھے۔ فقط

ذرّہ ناچیز
شمس
یکم دسمبر ۱۹۳۸ء

مولف — محمد باقر شمس

خوشنویس — عنایت الرحمٰن

ناشر — دارالتصنیف

طابع — الیکٹرک پریس

قیمت — تیس روپیہ

ملنے کا پتہ
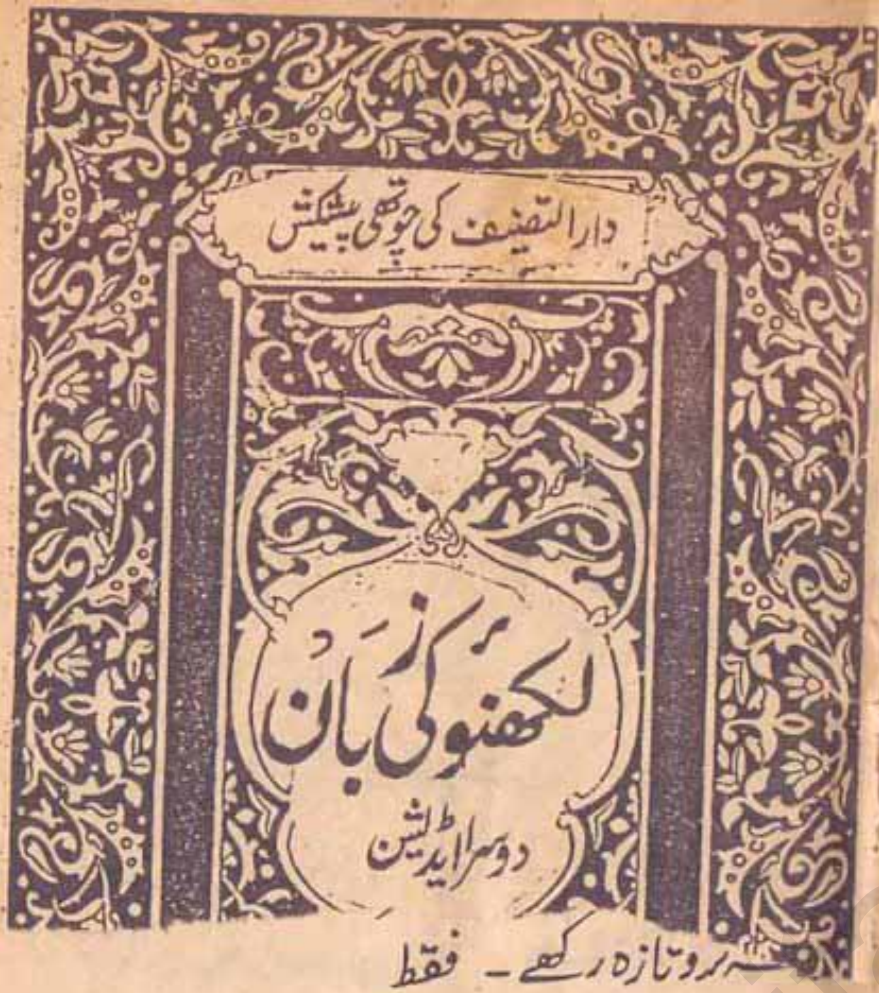
نذر عقیدت

ادب و تاریخ کے چمن زار کی سیر میں کچھ پھول اور کلیاں ہاتھ آئیں۔ جن سے یہ گلدستہ تیار کر کے خلوص و عقیدت کے ساتھ ادب و تعظیم کے ہاتھوں سے اُردو کے مجدد زبان کے مصلح شاعروں کے مقتدا انشا پردازوں کے پیشوا شستہ زبان کے خالق اور سنجیدہ شاعری کے موجد حضرت ناسخ کی بارگاہ میں پیش کرتا ہوں، خدا کرے کہ اس انتساب کا آبِ حیات اس گلدستہ کو ہمیشہ ترو تازہ رکھے۔ فقط

ذرّہ ناچیز

شمس

یکم دسمبر ۱۹۳۸ء

اعترافِ حقیقت

لکھنؤ زیست کا اردو کی سہارا تو ہے — اوجِ معنی کا چمکتا ہوا تارا تو ہے
تیرے ہر ذرّے میں تہذیب کی دنیا آباد — مشرقِ طرزِ سخن کا چمن آرا تو ہے
شانہ کش ہے تیری مشاطۂ علم و حکمت — دستِ تہذیب و تمدن کا سنوارا تو ہے
زلفِ الہام کا شانہ ہے تیری گویائی — قلزمِ شعر کا بہتا ہوا دھارا تو ہے
ناز کرتے ہیں علومِ عربیّہ تجھ پر — ہند میں آج سمرقند و بخارا تو ہے
شاہدِ گیسوئے معنی تھے پریشاں کب سے — جس نے اس زلفِ پریشاں کو سنوارا تو ہے
ناخدا ہو چکے جب بادِ مخالف سے تباہ — جس نے اس ڈوبتی کشتی کو ابھارا تو ہے
جس کی تخلیق ہے ناسخ کی رہینِ منّت — اسی مقیاس کا چڑھتا ہوا پارا تو ہے
ہر ادا جن کی ہے اک معجزۂ سحرِ حلال — انہیں جادو بھری آنکھوں کا اشارا تو ہے
افقِ شعر و سخن پر صفتِ قطبِ شمال — جو نکل کر کبھی ڈوبا نہ وہ تارا تو ہے

شاعری آج بھی کہتی ہے باآوازِ بلند
ہم جہاں میں ہیں ترے اور ہمارا تو ہے — شمسؔ

مولانا حالی کا اعتراف

اردو راج چار سو تیرا ہے — شہروں میں رواج گو بکو تیرا ہے
پر جب تک انیس کا سخن ہے باقی — تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا ہے

دیباچہ طبع دوم

اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہو چکا تھا مگر طلب باقی تھی خاص طور پر شعراء و ادبا و مصنفین کے تقاضوں نے دوسری اشاعت پر مجبور کیا۔ اس اشاعت میں معمولی رد و بدل ہوا ہے۔ کچھ مقامی باتیں آ گئی تھیں جنھیں حذف کر دیا ہے۔ باقی سب کچھ وہی ہے۔ آخر میں آکار ضمنی کے آراء کا اضافہ ہے

کتابت کی تصحیح اب مجھ سے نہیں ہو سکتی۔ پہلے بھی میں اس معاملہ میں مستعد نہ تھا اس وجہ سے میری تمام کتابوں میں کتابت کے اغلاط موجود۔ کاتبوں نے بعض جگہ اصلاح بھی کی ہے۔ ایک کتاب میں ادھ کچے کو ادھ پکا لکھا ہے جو شاید ان کے وطن کی بولی ہے۔ اس طرح کے اغلاط بھی میری کتابوں میں موجود ہیں جن کی تصحیح پڑھنے والوں کی دیانت انصاف اور فہم کے ذمہ ہے

ع

سپردم بتو مایۂ خویش را

بندۂ ناچیز

شمس

یکم جنوری ۱۹۹۲ء

دیباچہ طبع اول

بیسویں صدی کا حقیقت پسند - دانشمند - باریک بین اور روشن خیال انسان لیلائے آزادی کا ایسا مجنوں ہے کہ پابندی کے نام سے اس کو وحشت ہوتی ہے چاہے وہ جائز ہی کیوں نہ ہو یہاں تک کہ زبان کے معاملہ میں بھی کسی کی پیروی اور تقلید کو برداشت نہیں کرسکتا۔ اس لئے مرکز کی ضرورت اور اس کی اہمیت کا منکر ہے حقیقت میں اسے وہ اپنی خودداری کی آبروریزی سمجھتا ہے کہ شکل و صورت میں اپنے ایسے لوگوں کی بات چیت کو اتنا مرتبہ دے کہ اس کے خلاف زبان نہ ہلا سکے۔ مگر کچھ باتیں اتفاقی طور پر اور کچھ قدرت کی طرف سے بعض لوگوں کو مل جاتی ہیں جو نہ ان سے چھینی نہ دوسروں کو دی جا سکتی ہیں۔

زبان کے مرکز میں پیدا ہونے والوں کو اہل زبان ہونے کی فضیلت خود بخود مل جاتی ہے جس میں ان کی برابری ممکن نہیں۔

زبان کا قانون جو حقیقت میں فطرت کا قانون ہے اہل زبان کو پیروی پر مجبور کرتا ہے اور اس کی خلاف ورزی سے زبان بگڑ جاتی ہے [illegible] سے اس پر اصولی اور تاریخی گفتگو کی ضرورت محسوس کر رہا تھا مگر کوئی فرصت نہ ہونے سے وقت ٹلتا رہا۔ جون ۱۹۳۸ء میں ایک صاحب نے اخبار فراز میں اس بحث کا آغاز کیا۔ یہ ایک قومی محرک تھا جس نے مجھے اظہار خیال پر مجبور کر دیا اور مضامین کا ایک سلسلہ ختم ہو گیا مگر اخبار کی وجہ سے تفصیل طلب باتوں کو مجمل لکھنا پڑا۔ یہ کانٹا مضمون ختم کرنے کے بعد بھی کھٹکتا رہا اور اس کے نکلنے کی یہی صورت تھی کہ ایک مستقل کتاب

لکھ ڈالی جائے۔ چونکہ تاخیر اکثر میرے ارادوں کی موت کا سبب بن چکی ہے۔ اس لئے فوراً لکھنا شروع کر دیا اور چند ہی روز میں کتاب مرتب ہو گئی۔ جس کا خلاصہ ملک کے مشہور ادبی رسالہ نگار میں تین قسطوں میں شائع ہوا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ملک کے اہل قلم اور صاحبان ذوق نے اس کی امید سے زیادہ قدر کی اور نیاز فتحپوری نے اس پر نوٹ لکھا اس کا جواب محال ہے ۱۹۴۸ء میں کتاب پریس جا رہی تھی کہ ملک میں انقلاب ہوا اور میں پاکستان چلا آیا یہاں مالکان دار التصنیف نے اس کو شائع کرنے کا ارادہ کیا اور کتاب چھپنے کی منزل میں آئی۔

نظر ثانی میں بعض فقرے اور مثالیں ایسی آ گئی ہیں جن سے کتاب میں تازگی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ مضمون جسے اس کتاب کا خاکہ سمجھنا چاہئے آخر میں ضمیمہ کے طور پر داخل کر دیا گیا ہے۔ اس میں زبان پر جو بحث تھی وہ کتاب میں زیادہ مکمل صورت میں آ گئی ہے اس لئے خارج کر دی گئی۔

اب صرف لکھنؤ کی شاعری پر بحث رہ گئی۔

کتاب کی تصنیف کے بعد بعض نئی کتابیں شائع ہوئیں جن میں کچھ کام کی باتیں مل گئیں ان کو حسب موقع بڑھا دیا گیا۔ اب یہ تمام سرمایہ آپ کی نذر ہے۔

والسلام

ذرہ ناچیز

محمد باقر شمس

کراچی ۱۹۵۴ء

مقدمہ

ہر زبان مجموعہ ہوتی ہے الفاظ روزمرّہ محاورہ اور ضرب الامثال کا جن کے کچھ معنی ہوتے ہیں اور ایک محلِ صرف ہوتا ہے۔ لفظوں سے لفظیں بنانے اور ان کو آپس میں ملانے کے کچھ قاعدے ہوتے ہیں ان سب کی پابندی پر زبان کی درستی کا دارو مدار ہے۔ اردو دہلی اور لکھنؤ کی بول چال کا نام ہے وہیں کے لوگوں کے محلِ استعمال کو پیشِ نظر رکھ کے محاوروں اور لفظوں کے معنی اور صرف و نحو کے قاعدے بنائے گئے ہیں جن کی پابندی سے ہم کو مفر نہیں۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ

متاخرین کے ذوقِ صحیح نے برسوں کے بعد آنے والی حالت کا اندازہ کر لیا اور وہ الفاظ و ترکیبیں ترک کر دیں جو آئندہ ہونے والی تھیں لیکن آج ہمارے سامنے بھونڈی لفظیں، بھدی ترکیبیں زبان میں داخل ہوتی جا رہی ہیں اور ہمیں اندازہ نہیں۔ ع

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

دو سو برس ادھر کے لوگوں نے زبان کے جن نازک پہلوؤں کو سمجھ لیا تھا اُن کو آج بیسویں صدی کے لوگ جنھیں حقیقت پسند اور روشن خیال کہا جاتا ہے نہیں سمجھ سکے۔ نثر نگار ہوں یا شاعر جسے دیکھئے اپنی جگہ اینٹھے اور ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے بیٹھے ہیں۔

اپنی دانست میں جتنے بھی سخن گستر ہیں — نظم میں نثر میں غالبؔ کہیں بہتر ہیں
ہاتھ میں سب کے ہے اردوئے معلّی کا نشاں — منھ میں رکھتے ہیں زباں اس لئے ہیں اہلِ زباں
کوئی مقیاس معیّن ہے نہ کوئی معیار — صاحبِ طرز ہے ہر ایک پریشاں گفتار
بے تمیزی کا یہ طوفان جہاں برپا ہو — کیجئے اس ملک میں اردو کو ترقی کیا ہو

یہ کتاب اسی غرض سے شائع کی جا رہی ہے کہ زبان کی بقا اس کی صحت اور ترقی کے اصول۔ تاریخ اور فلسفۂ لسان کی روشنی میں سب کے سامنے آ جائیں اور کوئی گوشہ تاریک نہ رہے۔ امید ہے کہ اہلِ نظر صاحبانِ فہم، اربابِ تحقیق۔ اور ذوقِ سلیم کے مالک اردو سے ہمدردی رکھنے والے حضرات غور و فکر کے چند لمحے اس پر بھی صرف کریں گے کہ وہ امانت جو اسلاف سے ہمیں اس لئے ملی ہے کہ اس سے بہتر حالت میں اخلاف کے سپرد کی جائے کم سے کم بغیر خیانت ہی منتقل ہونے کے قابل رہے۔ فقط

والسلام

ذرّۂ ناچیز

محمد باقر شمس

کراچی ۱۹۵۴ء

پہلا باب

مستند زبان
فلسفۂ لسان کی روشنی میں

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

زبان کے لئے مرکز کی ضرورت ہماری زبان سے جو لفظیں نکلتی ہیں وہ صحیح ہوں گی یا غلط اور اس کی جانچ کا ذریعہ صرف و نحو کے علاوہ کوئی اور نہیں۔ کسی زبان کی صرف و نحو اسکے ساتھ نہیں بلکہ بہت کچھ ترقی کرنے کے بعد بنتی ہے۔

زبان اپنے محلِ استعمال میں نامحدود ہے۔ ہر طبقہ کے لوگ اسے بولتے ہیں اور ہر طبقہ کی مخصوص معاشرت کا اثر اس کی زبان پر پڑتا ہے۔ اسی سے ہر ایک کی زبان الگ الگ نام سے پکاری جاتی ہے، جیسے شہری، دیہاتی، زنانی، مردانی، خواص کی، عوام کی، اسی طرح ہر شہر کی زبان، اپنی مخصوص لفظوں، محاوروں اور اُن کے محلِ استعمال میں دوسرے شہر کی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ دکن میں آپ کو کیا ہونا ہے (آپ کو کیا چاہیے)، میں سُنا ہوں (میں نے سُنا ہے) بیگم صاحب گئے (گئیں) میرٹھ اور اُس کے نواح میں وہ آلیا (وہ آگیا) بھاگ کے جاؤ (دوڑ جاؤ) روہیلکھنڈ میں آوازا چھا ہے۔ الہ آباد میں جلسہ کی کارروائی شروع ہونے جارہی ہے (ہونے والی ہے)۔ رائے بریلی اور اسکے اطراف میں یہ کو وہ کو (اس کو اُس کو) جگہ یہ ہر خاص و عام کی زبان پر ہے۔

سب کی زبان پر ہے۔ ایسی حالت میں ایک قاعدہ نویس ہکا بکا ہو جاتا ہے اور صرف و نحو وجود میں نہیں آتی وہ مجبور ہوتا ہے کہ کسی ایک شہر اور اس شہر کے بھی ایک طبقہ کی زبان کو سامنے رکھ کے قاعدے بنائے لیکن کس شہر اور کس طبقہ کو منتخب کرے آخر یہ اصول بنانا پڑتا ہے کہ جس کی زبان لطافت و پاکیزگی میں بہتر ہو وہی انتخاب کے لائق ہے۔ اگر یہ اصول تسلیم نہ کیا جائے تو کوئی زبان علمی، ادبی، ملکی اور قومی نہیں بن سکتی نہ اس کی صرف و نحو وجود میں آسکتی ہے۔ جب ہم شہر کو زبان کا مرکز اور ہر شخص کو اہلِ زبان مان لیں گے تو جو جس طرح بولے گا وہی صحیح ہوگا۔ اس صورت میں اتنے اختلاف پیدا ہو جائیں گے کہ کوئی قاعدہ نہ بن سکے گا دورِ حاضر کے مشہور مصنف پروفیسر مسعود حسن صاحب ادیب کی رائے یہ ہے:۔

> اگر زبان کی صحت اور فصاحت کا کوئی معیار ہی نہ مقرر کیا جائے اور ہر جگہ کے مخصوص الفاظ و محاورات کا استعمال جائز رکھا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک مقام کے رہنے والے کی تحریر دوسرے مقام کے باشندے نہ سمجھ سکیں گے اور ایک مفہوم کے لئے بے ضرورت اتنے الفاظ و محاورات زبان میں داخل ہو جائیں گے کہ ان سب سے واقفیت اور ان سب پر عبور حاصل کرنا کسی کے امکان میں نہ رہے گا۔ مختصر یہ کہ بغیر کوئی معیار مقرر کئے ہوئے اردو زبان سمجھنے والوں کا حلقہ وسیع نہ ہو سکے گا اور ملک کی مشترکہ زبان نہ بن سکے گی ان ہی وجوہ سے کسی مقام کو زبان کا مرکز قرار دینا بھی ضروری ہے[1]

[1] نظامِ اردو

اسی لئے جو شہر زبان کا مرکز ہوتا ہے اس کے بھی تمام باشندے اہل زبان نہیں سمجھے جاتے ۔ میر انشاء اللہ خاں انشا لکھتے ہیں

سند اردو از گفتگوئے ملوک و امراء و حواشی و حضار شان جستن بہتر است کہ فقیہ و شاعر و مہندس و محاسب و منشی و صوفی و زنان پری چہرہ در مجلس شاں و حاضر می باشند و اصطلاح ہر فرقہ در گوش دارند ۔ و در لفظیکہ اصلاح جاری می کنند بزرگ و کوچک را در قبول کردن گریز نہ باشد و زود تر مروج می شود و ہر شخص فصیح و بلیغ در مجلس شان گنگ می گردد و اگر سخنے را درست می گوید و بپسند امیر و حضار می شود نزد اماثل و اقران ذکر آن بزبان می آرد ۔ و صاحب کمال را در خاطر خلد کہ مبادا حرفے از زبان من برآید کہ موجب ریشخند شود ۲؎

اسی حقیقت کو مولانا صفی نے دو مصرعوں میں یوں نظم کیا ہے ۔

بسکہ اصلاح سخن میں کی گئی ہے جد و کد — سب سے بڑھ کر ہے زبان لکھنؤ کی مستند

اگر زبان کا دائرہ اتنا محدود نہ کیا جائے تو ہر شہر کی زبان اس کے جغرافیہ کی طرح محدود ہو جائے یہ سچ ہے ؎

مرکزی قوت سے جب ہٹتے گئے — جس قدر بڑھتے گئے گھٹتے گئے (صفی)

الفاظ کی صحت کا معیار

دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جس کے جانچنے کا کوئی معیار نہ ہو ۔ زبان کا معاملہ یہ ہے کہ

۲؎ دریائے لطافت ص ۲۷

کسی زبان کی لفظیں خدا کی طرف سے نازل نہیں ہوئیں[۱] جس سے ان کا صحیح تلفظ معلوم ہو جائے تو ان کی صحت کا معیار بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہم کچھ لوگوں کے تلفظ کو معیاری مان لیں اور جو لفظ جس طرح اُن کی زبان سے نکلے وہی تلفظ اس کا صحیح سمجھیں نہیں تو کسی لفظ کے صحیح یا غلط ہونے کا کوئی قاعدہ نہیں رہ جائے اور آخر کے مشہور اخبار نو شیخ ممتاز حسین (ایڈیٹر اودھ پنچ) لکھتے ہیں :-

زندہ زبانوں میں کوئی ایسی نہیں جس کا مرجع کوئی خاص قطعہ زمین نہ ہو ۔ فارسی میں شیراز و طہران کی زبان مستند ہے ۔ انگریزی زبان لندن کی مستند ہے امریکہ میں بھی انگریزی مروج ہے لیکن امریکہ زبان کے اعتبار سے لندن کی خوشہ چینی کرتا رہتا ہے ۔ سیاسی خیالات میں خلاف و عناد ہے ۔ مگر ادبی خیالات میں شمہ بھر نا اتفاقی نہیں ہے ۔ علیٰ ہذا القیاس آسٹریلیا اور افریقہ (جہاں کئی پشتوں سے انگریز آباد ہیں اور وہ اپنی قوم کو علیحدہ قوم تصور کرتے ہیں) لندن کو معیار و مرکز زبان تسلیم کرتا ہے ۔ اودھ پنچ

۱۵ اپریل ۱۹۱۶ء

مولانا صفی کہتے ہیں ؎

صحن عالم میں نہیں کوئی زبان بے مرکز

۱؎ قرآن کو مسلمان لفظاً لفظاً منزل من اللہ سمجھتے ہیں لیکن وہ بھی قریش کی زبان اور ان کے لہجے میں نازل ہونے کے قائل ہیں اور قریش کی زبان تمام عرب میں فصیح ترین سمجھی جاتی تھی کیونکہ وہ تہذیب و تمدن علم و فضل شرافت و نجابت میں سب سے بہتر تھے ۱۲ -

لہذا اردو کا بھی ایک مرکز ماننا ضروری ہے۔ بے شک اس کے لئے کوئی اصول ہونا چاہیئے جس کی بنا پر ہم کسی شہر کو مرکز کہہ سکیں

حرفوں کی تشکیل میں آب وہوا کا اثر

یہ جتایا جا چکا ہے کہ لفظوں کا سانچہ اہل زبان کی زبان ہے جو لفظ جس طرح اُن کی زبان سے نکلے وہی اس کا اصلی تلفظ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح مختلف ملکوں کے رہنے والے آب وہوا کے اثر سے صورت، عادت، اور طبیعت میں مختلف ہوتے ہیں اسی طرح ان کے گلے، جبڑے، حلق، تالو، زبان اور ہونٹ کے لوچ میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ہر ملک کے لوگ اپنے اصلی حرف بے تکلف ادا کرلیتے ہیں اور وہی آواز اس کی معیاری ہوتی ہے لیکن دوسرے ملکوں کے حرف صاف ادا نہیں کرسکتے اور وہ آواز معیار سے گرجاتی ہے۔ عرب "ٹٹو" کو "تتو" "لڈو" کو "لدو" یورپ کا باشندہ "گھوڑے" کو "گھورے" کہتا ہے۔

لہجہ پر آب وہوا کا اثر

جس طرح ہر ملک کے باشندوں کی آواز اُن کی زبان۔ ہونٹ، تالو اور حلق کی ساخت کے موافق ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کا لہجہ بھی آب وہوا کے اثر سے مختلف ہوتا ہے، وہ اپنی ہی لفظیں صاف ادا کرسکتے ہیں۔ عرب بمبئی کو "بُم بائی" انگریز بام بے۔ کشمیری لکھنؤ کو "لوکنو" عرب "لکھنا ہور" انگریز "لکناؤ" کہتے ہیں۔ اس سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ ہر ملک کی لفظیں اہل ملک ہی کے لہجہ میں معیاری تلفظ رکھتی ہیں۔

زبان پر آب وہوا کا اثر

ہر بارہ کوس کے فاصلہ پر آب وہوا میں کچھ تغیر ہو جاتا ہے اتنا ہی رسم ورواج طبیعت ومزاج میں اور اسی قدر لہجہ اور زبان میں فرق پڑ جاتا ہے۔ ایک وسیع ملک کے مختلف حصوں میں مختلف زبانوں کا پایا جانا اسکی دلیل ہے۔ ایران میں سات زبانیں مروج تھیں۔

(۱) ہروی :۔ ہرات کے علاقہ میں بولی جاتی تھی۔

(۲) سگزی :۔ سرزمین رستم وسہراب یعنی سیستان (زابل) کی زبان تھی

(۳) زاولی :۔ قندھار وغزنی اور اس کے اطراف کی بولی تھی۔

(۴) سغدی :۔ سمرقند وغیرہ میں مروج تھی۔

(۵) دری :۔ قہستان کی زبان تھی جہاں اس کا نشان اب بھی کچھ ملتا ہے۔ نقش رستم اور خرابات اسٹخر میں جو کتبے پائے جاتے ہیں وہ اسی زبان میں ہیں۔

(۶) پہلوی :۔ زرتشت کی مقدس کتاب ژند اور اس کی شرح پاژند اس کی تفسیر اوستا یا آوستا اور اس کا خلاصہ خوردہ اوستا اسی زبان میں لکھی گئی تھیں۔ پُرانی فارسی کی جو کچھ پونجی پارسیوں کے پاس یا ایشیا و یورپ کے کتب خانوں میں ہے وہ سب اسی زبان میں ہے۔

(۷) فارسی :۔ صوبہ فارس کی زبان ہے جس کا دارالحکومت شیراز تھا۔

ہندوستان کی داستان بھی ایسی ہی ہے۔ مہامہوپادھیائے پنڈت گوری شنکر ہیرا چند او جھا نے "قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب" کے عنوان سے چند خطبے دیئے ہیں۔ ان خطبوں کا اردو ترجمہ (ہندوستانی اکاڈمی کا شائع کیا ہوا) ہمارے پیش نظر ہے فاضل موصوف نے سنسکرت کے بعد پراکرت زبانوں کا حال لکھا ہے۔ اور ان کی چھ قسمیں

بتائی ہیں

(١) ماگدھی :۔ مگدھ اور اس کے آس پاس کی زبان تھی۔

(٢) سورسینی :۔ سورسین متھرا کے قرب وجوار کے علاقوں میں بولی جاتی تھی [1]

(٣) مہاراشٹری :۔ مہاراشٹر یعنی ودبھ کی بولی تھی۔

(٤) پیشاچی :۔ کشمیر اور ہندوستان کے مغربی و شمالی کنارے کی زبان تھی۔

(٥) اونتک :۔ اونتی یعنی مالوہ کی عام زبان تھی۔ یہ اُجین اور مندسور میں مروج تھی۔

(٦) اپ بھرنش :۔ اس زبان کا رواج گجرات، مارواڑ، جنوبی پنجاب، راجپوتانہ، اجین اور مندسور وغیرہ مقامات میں تھا۔ دراصل یہ کوئی زبان نہ تھی۔ بلکہ ماگدھی وغیرہ پراکرت بھاشاؤں کی بگڑی ہوئی مخلوط بھاشا کا نام ہے۔ قدیم ہندی بیشتر اسی بھاشا سے نکلی ہے۔

جنوبی ہند کی بھاشائیں ان کے علاوہ ہیں۔

تامل :۔ جنوبی ہند کی زبانوں میں سب سے قدیم اور فائق ہے۔

ملیالم :۔ ملیبار کی زبان ہے۔

کنڑی :۔ اس زبان کی پرداخت جینیوں کے ہاتھ سے ہوئی۔

تلیگو :۔ اندھرا صوبہ میں مروج تھی

---

[1] مجھے اس سے اختلاف ہے سورسینی پراکرت صرف متھرا کے علاقہ کی زبان نہیں بلکہ پورے شمالی ہند کی زبان ہے۔ جو ہر خطہ میں اس خطہ کے نام سے منسوب ہے مثلاً ماگھدھی اودھی برج بانگڑو ہریانی وغیرہ

زبان پر سیاسی اثر اصول سیاست کا تقاضا ہے کہ تمام صوبوں کو ایک لسانی رشتہ سے جوڑ دیا جائے۔ دارالسلطنت کی زبان حکومت کی زبان ہونے کی وجہ سے خواہ مخواہ معیاری قرار پا جاتی ہے۔ ہر صوبے کے باشندے دفتری ضرورت اور شاہی قربت کی خواہش میں اس کو شوق سے حاصل کر کے اسی سانچے میں اپنی زبان کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رفتہ رفتہ صوبجاتی زبانوں پر دارالسلطنت کی زبان غلبہ حاصل کر لیتی ہے۔ کچھ زمانہ کے بعد سب زبانیں مردہ ہو جاتی ہیں اور پایہ تخت کی زبان پورے ملک کی زبان بن جاتی ہے [1]

---

[1] ہندوستان ہمیشہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا رہا۔ اس وجہ سے کوئی زبان پورے ملک پر کبھی حکمرانی نہ کر سکی۔ مسلمانوں کے وقت سے ملک کا بہت بڑا حصہ ایک حکومت میں رہا مگر ان کی زبان غیر ملکی ہونے کی وجہ سے عام زبان نہ بن سکی تھی جب ان کی نسل کے کئی طبقے یہاں گذرے تو ان کی مادری زبان بھی یہی دیسی (جو دہلی میں مقامی اور دوسری دیسی اور بدیسی زبانوں کے اختلاط اور مختلف قوموں کے ارتباط سے بن کر تیار ہوئی تھی) ہو گئی۔ اب یہ زبان حکومت کی زبان بن گئی تو کچھ دنوں میں ہندوستان بھر میں بولی اور سمجھی جانے لگی۔ اگر ایک ہزار برس تک یہی حالت باقی رہ جاتی تو تمام صوبجاتی زبانیں مردہ ہو جاتیں جس طرح ایران کی تمام زبانیں مر گئیں اور فارس کی زبان پورے ملک کی زبان بن گئی۔ حقیقت میں ایران کے ایک صوبہ کا نام "فارس" ہے۔ اسی صوبے کی زبان فارسی کہلاتی تھی۔ مسیح سے پانسو انسٹھ برس یا پانسو پچاس برس پہلے یہاں ایک زبردست خاندان کو عروج ہوا جو ایران کا دارا تھا ۵۵۹ ۵۵۰

لیکن آب و ہوا کے اختلاف سے ہر جگہ کا مخصوص لہجہ اور مقامی لفظیں اور محاورے کچھ نہ کچھ رہ جاتے ہیں جس سے اور صوبوں کی زبان معیار سے گر جاتی ہے۔

ہندوستان بھی قدرت کے اس قانون سے مستثنیٰ نہیں۔ یہاں بھی

(بقیہ حاشیہ ص—) (آثار قدیمہ) اور جدید تاریخی تحقیقات کے مطابق ہنجامینی یا ہنجا منشیہ کہا جاتا ہے جس کا آخری تاجدار داریوش تھا جو دارا کے نام سے مشہور ہے اور سکندر کے ہاتھوں نمک حرام جنرلوں کی سازش سے مارا گیا۔ چوتھی صدی ہجری کا مشہور مورخ ابو محسن علی مسعودی (متوفی [۳۴۶] ہجری) اس خاندان کا نام کیانی بتایا جاتا ہے۔ فردوسی طوسی بھی اس کا ہم نوا ہے ؎

سکندر ہمہ جامہا کرد چاک   بتاج کیاں بر پراگندہ خاک

اس خاندان کی حکومت عجم اور عرب مورخوں کی تحقیقات کے مطابق سات سو تیس [۷۳۲] یا پانچسو چھہتر سال رہی جو تاریخ میں ملوک الطوائف کہے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اسی فارس کی خاک سے ایک دوسرا خاندان اٹھا جس نے ملوک الطوائف کا خاتمہ کرکے مستقل حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اس خاندان کا پہلا فرماں روا اردشیر بن بابک تھا۔ جس کی تخت نشینی [۲۲۶] میں ہوئی اس خاندان میں چار سو چھبیس [۴۲۶] یا چار سو انتالیس [۴۳۹] سال تک حکومت رہی جس کا آخری حکمراں یزدجرد سوم تھا جو شمشیر اسلام سے قتل ہوا۔ تقریباً گیارہ سو برس تک صوبہ فارس دو زبردست حکومتوں کا مرکز رہا۔ اس لئے اس صوبہ کی زبان تمام ماتحت صوبوں پر غلبہ حاصل کرکے پورے ملک کی زبان بن گئی۔ اب فارسی کا اطلاق پورے ملک کی زبان پر ہوتا ہے۔

ملک کے مختلف حصوں کی آب و ہوا مختلف ہے۔ اس وجہ سے ہر حصّہ کی زبان اور لہجہ الگ الگ ہے۔ پنجابی "پتھر" کو "پھتر" "پنجاب" کو "پجاب" "کھائیگے" "کو کھانگے" اور بنگالی "کالا" "کو" "کالو" کہتے ہیں۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ دوسرے صوبہ کا آدمی شمالی ہند کے باشندوں کی طرح اردو نہیں بول سکتا اس لئے کہ یہ زبان یہاں پیدا ہوئی اور یہیں پروان چڑھی۔ یہیں کے رہنے والوں کے گلے جبڑوں زبان اور لب کے لوچ کے موافق لہجہ اور آواز میں اسکے الفاظ کا تلفظ اصلی اور مستند سمجھا جانا لازمی ہے۔ اس صورت میں جب دوسرے صوبہ کا آدمی اردو بولتا ہے تو اس کے لہجہ میں اس کے الفاظ معیار سے گر جاتے ہیں معلوم ہوا کہ جو زبان جہاں نشو و نما پاتی ہے وہیں اس کا مرکز بھی ہونا چاہیئے۔ مگر زبان تو بہت سے شہروں میں بولی جاتی ہے۔ اور مرکز ایک ہی دو شہر ہوتے ہیں۔ اس کو سمجھنے کے لیئے زبان کی ابتدا پر نظر کرنا ہوگی

دیہات کی زبان تنگ اور شہر کی زبان وسیع کیوں ہوتی ہے

لفظوں کا دامن ضرورتوں کے دامن سے بندھا ہوا ہے دیہاتیوں کی محدود ضرورتیں تھوڑی سی لفظوں میں پوری ہو جاتی ہیں اور تہذیب و تمدن سے بیگانگی لفظوں کو تراش خراش کی خوشنمائی سے آشنا نہیں ہونے دیتی۔ اس وجہ سے ان کی زبان تنگ اور غیر معیاری ہوتی ہے۔ اس کے برعکس شہریوں کی ضرورتیں وسیع اور طرز معاشرت نفیس ہوتا ہے ہر چیز میں نفاست اور لطافت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی زبان کو بھی وسیع و شستہ بنا دیتے ہیں۔

زبان پر تہذیب و تمدن کا اثر

اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ زبان کی

اصلاح تہذیب و تمدن کے ہاتھوں سے ہوتی ہے۔ جتنا تمدن ترقی کرتا جائیگا زبان کا معیار بلند ہوتا جائے گا۔ اور جس جگہ اس کی ترقی کمال کو پہونچ جائے گی وہیں کی زبان معیاری قرار پائے گی۔ اور تہذیب

تہذیب کی ترقی کہاں ہوتی ہے

و تمدن کی ترقی دار السلطنت میں ہوتی ہے وہیں قدردانی کشش ارباب کمال کو کونے کونے سے کھینچ لیتی ہے۔ یہ صاحبان کمال ہر چیز کو اپنی اصلاح سے دیدہ زیب اور دلفریب بناتے رہتے ہیں۔ یہی تصرف ان کا زبان پر بھی ہوتا ہے۔ جس کی بدولت اس شہر کی زبان دوسرے شہروں کی زبان سے ممتاز ہو جاتی ہے۔ حضرت انشاء کہتے ہیں:۔

در ہر مملکت قاعدہ ایں است کہ صاحب کمالان و خوش بیانان آنجا در شہرے کہ قرارگاہ ارکان دولت بادشاہی باشد جمع شوند و از کثرت ورود آدم ہر دیار برائے تحصیل قوت در آں باشندگانش در تحریر و تقریر از ساکنان بلاد دیگر آں ولایت باشند مانند صفاہان ایران کہ مدتہا دار السلطنت سلاطین صفویہ بود زبان و بیان سکنہ آنجا بہ از زبان مردم جائے دیگر در ایران می گرفتند و می گیرند یا استنبول کہ محل جلوس سلطان روم است۔

چوں بیشتر جلائے عیش سلاطین تیموریہ دار الخلافت شاہجہان آباد بودہ است و فصیحان و بلیغان و علمائے قدر فریقین و دیگر ارباب فنون لطیفہ و اصحاب علوم شریفہ در آں شہر دلنواز آرام گاہے برائے خود ساختہ بودند...... خوش بیانان آنجا متفق شدہ از زبانہائے متعدد الفاظ دلچسپ جدا نمودہ در عبارات و الفاظ تصرف بکار بردہ زبانے تازہ سوائے زبانہائے دیگر بہم رسانیدند و باردو موسوم ساختند

ظاہر است کہ از روے کہ شاہجہاں بادشاہ غازی ایں قلعہ را آباد ساختہ موسوم بشاہجہاں آباد کرد از آں روز تا امروز مسکن بادشاہ ہنداست در زمانہ سابق مردم ہر شہر دارد می شدند و کسب آدمیت می کردند و باشندہ آنجا بشہر دیگر نمی رفت و اگر بحسب فرورتے می رفت بزرگ زادہائے عالی قدران بلدہ بزیارتش می آمدند در صحت او قوانین نشست و برخواست و حرف زدن و دیگر آداب مجلس یاد می گرفتند۔[1]

اردو کے مشہور انشاء پرداز حضرت آزاد لکھتے ہیں:۔

میرے دوستو! تم جانتے ہو کہ ہر شے کی اصلیت اور حسن و قبح کے واسطے ایک مقام ایسا ہوتا ہے جیسے سکہ کے لئے ٹکسال کیا وجہ ہے کہ ابتداء میں زبان کے لئے دہلی ٹکسال تھی؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ دار الخلافہ تھی، دربار یہیں تھا خاندانی امرا اور امیر زادے خود صاحب علم ہوتے تھے۔ ان کی مجلسیں اہل علم اور اہل کمال کا مجمع ہوتی تھیں۔ اسی واسطے گفتگو، لباس، ادب، آداب، نشست و برخواست بلکہ بات بات ایسی سنجیدہ اور پسندیدہ ہوتی تھی کہ خواہ مخواہ سب کے دل قبول کرتے تھے۔ ہر شے کے لئے ہمیشہ نئی نئی تراشیں اور نئی نئی اصلاحیں اور ایجاد و اختراع وہاں سے ہوتی رہتی تھی اور چونکہ دار الخلافہ میں ہر شہر کا آدمی موجود تھا۔ اس لئے وہ دلپذیر ایجادیں اور اصلاحیں ہر شہر میں عام ہو جاتی تھیں۔[2]

ان شہادتوں سے ثابت ہو گیا کہ زبان کا مرکز فرضی نہیں ہوتا بلکہ

[1] دریائے لطافت ص۱ [2] آب حیات مطبوعہ کریمی پریس لاہور ص۲۶

اس قانون کے تحت ہے کہ جب تک مذکورہ بالا خصوصیتیں کسی شہر کی خاک سے وابستہ رہیں گی۔ اس وقت تک وہ زبان کا مرکز رہے گا۔ انھیں خصوصیتوں سے دہلی کو ایک مدت تک مرکزیت فخر حاصل رہا۔ اور جب لکھنؤ ان خصوصیتوں سے مخصوص ہو گیا تو اسی کو

لکھنؤ کیوں زبان کا مرکز ہے

مرکزیت کا درجہ مل گیا۔ مولوی عبد السلام ندوی لکھتے ہیں۔

منتخب اور برگزیدہ لوگوں نے لکھنؤ کا رخ کیا اور اس طرح دلی نے قالب بدل کے گویا دوسرا جنم لیا اور شاعرانہ حیثیت سے جو مرکزیت پہلے اس کو حاصل تھی وہ اب لکھنؤ کو حاصل ہو گئی۔[1]

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد دہلوی تحریر فرماتے ہیں :-

انہی صفتوں سے لکھنؤ نے سند افتخار حاصل کی لکھنؤ کو دیکھ کر سمجھ لو کہ دل پسند ایجادوں اور رنگین باتوں کا ایجاد ہونا کسی شہر کے اینٹ پتھر کی تاثیر نہیں ہے جہاں شائستہ اور رنگین مزاج لوگ جمع ہو جائیں گے وہیں سے پھول کھلنے لگیں گے۔ چنانچہ وہی دہلی کے لوگ اور ان کی اولاد تھی کہ جب تباہی سلطنت و آبادی لکھنؤ کے سبب سے وہاں پہونچے تو چند روز میں ویسی ہی تراشیں وہاں سے نکلنے لگیں لکھنؤ دار السلطنت ہو گیا اور اس کے ضمن میں زبان بھی دلی کی اطاعت سے آزاد ہو گئی۔[2]

علم و تہذیب میں لکھنؤ کا درجہ

ان صفتوں میں لکھنؤ نے کتنی ترقی کی

---

[1] شعر الہند [2] آبحیات ص ۲۶

اس کو مولوی امیر احمد صاحب علوی بی۔ اے کی زبانی سنیئے :-

جب سقراط نے ہوش سنبھالا اور آنکھیں کھولیں تو یہ وہ زمانہ تھا کہ خطہ یونان میں علم و ہنر پھٹ پڑا تھا۔ بڑے بڑے دانشمند، حکیم، فلاسفر، مورخ، شاعر۔ اس وقت دار السلطنت میں موجود تھے۔ اور کسی علم کے سیکھنے کے لیے باہر جانے کی ضرورت نہ تھی۔ صرف بازاروں اور سیرگاہوں میں چہل قدمی کرنا تہذیب اور انسانیت سکھانے کے لئے کافی تھا۔ اسی طرح ــــــ یہ دار السلطنت (لکھنؤ) بھی شاعری اور نثاری کا معدن، فصاحت و بلاغت کا معیار، زبان و محاورات کی ٹکسال شائستگی و تہذیب کا گھر، دولت و ثروت کا سرچشمہ اور حشمت و جاہ و جلال کا خزانہ یا یوں کہو کہ دودھ کی مستعجل دولت کا دل کش مستقر تھا جس کے شیدائی دعوے سے کہتے تھے ؎

گو ملی جنت بھی رہنے کو بجائے لکھنؤ
چونک اُٹھتا ہوں میں ہر دم کہکے ہائے لکھنؤ

یہ وہ مبارک عہد ہے کہ رئیس و فقیر، امیر و وزیر، شاہ و گدا غرض جس کے دل میں ذرا سا بھی سوز و گداز کا جوہر موجود ہے وہ سخن فہم اور قدر دان سخن ہیں اُن کی ہمت افزائیوں سے مسرور اور مضامین و خیالات کے اُن گراں بہا انبار سے جو متقدمین اپنے نشان قدم پر چلنے والوں کے لیے چھوڑ گئے ہیں مستفید ہو کر ناسخ، آتش، خلیل، صبا، وزیر، تسلیم، انیس و دبیر وغیرہ نظم اردو کو معراج کمال پر پہنچانے اور زبان لکھنؤ کو قید دہلی سے آزاد کرنے کا بیڑا اُٹھائے ہیں ؎

رنگ کھل جاتا ہے یاں کھوٹے کھرے کا بڑا
لکھنؤ اہل ہنر کے لئے ٹکسال ہے آج

اللہ اللہ کیا بابرکت عہد تھا اور کیسے کیسے متبرک نفوس تھے جنھوں نے
اپنی قیمتی عمریں اصلاح زبان اور اصلاح سخن اور اصلاح مضامین
کی نذر کردیں۔ غرض اس وقت قدیم ایتھنس کی طرح علم و ہنر کا
بحر مواج جوش زن تھا۔ اور زبان دانی اور مضمون آفرینی کا
یہ شہر ایسا مرکز ہو رہا تھا کہ اس کی دل کش سیر گاہوں۔ اس کے
دلچسپ منظروں اس کے دلچسپ میلوں ٹھیلوں کی بہار دیکھنا بھی
انسان کو تہذیب سکھانے کے لئے کافی تھا

اس وقت یہاں کی خاک پاک علم و فضل بانٹتی نہیں بلکہ کوڑیوں
کی طرح لٹاتی تھی ؎

سنا رضواں بھی جس کا خوشہ چیں ہے ۔۔۔ وہ بے شک لکھنؤ کی سرزمیں ہے

یہ اُس وقت کہا گیا تھا اور حسب حال تھا ؎

کہاں ہوں گی امیرؔ ایسی دانیں حور و غلماں میں
رہے گا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں

یہ کچھ دنوں کے بعد ایک پیغمبر سخن کی زبان پر آیا ۱؎

مولانا عبدالحلیم شررؔ تحریر فرماتے ہیں :۔

زبان اور شاعری کے کمالات کے ساتھ لکھنؤ نے علم و فضل
میں بھی ہندوستان کے تمام شہروں سے زیادہ ترقی کی۔ اگر سچ پوچھئے
تو علوم کے اعتبار سے لکھنؤ ہندوستان کا بغداد اور قرطبہ اور
اقصائے مشرق کا نیشاپور و بخارا تھا ـــــ لکھنؤ کے پہلے مجتہد

۱؎ تذکرۂ رند ص۵۵ تا ۶۰

مجتہد مولوی دلدار علی صاحب نے چونکہ عراق میں تعلیم پائی تھی ۱؎
لہٰذا عربی کا نیا ذوق اپنے ساتھ اور ادبیت میں خاندان اجتہاد اور

۱؎ لکھنؤ میں ایک علمی گھرانا خاندان اجتہاد کے نام سے مشہور ہے اس کے
مورث اعلیٰ غفرانمآب تھے جن کا نام دلدار علی ہے ان سے پہلے ہندوستان میں
شیعہ کسی جماعت یا قوم کی حیثیت نہیں رکھتے تھے نہ عام طور سے اپنے عقائد سے واقف تھے
مذہبی رواسم اور فرائض بھی عام مسلمانوں کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ انھوں نے آصف الدولہ
کے زمانہ میں لکھنؤ کو اپنا مستقر بنایا۔ علم کلام و مناظرہ میں بڑی زور دار کتابیں لکھ کر
شیعیت کا اصلی مفہوم بتایا اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری کرکے اپنے شاگردوں کو تمام
ہندوستان میں پھیلا کر عقائد کی تبلیغ اور جمعہ و جماعت کے قیام کے ساتھ بہت سے مذہبی اور
قومی رواسم قائم کئے اور بہت سے بند کرائے۔ مثلاً سید احمد کبیر کی گائے۔ شیخ سدو کے گلگلے۔
پیری مریدی۔ قبروں پر چادریں چڑھانا۔ قوالی اور سماع وغیرہ۔ تعزیہ داری کا طریقہ بھی عام
مسلمانوں سے علیحدہ قائم کیا۔ تعزیوں کی شکلیں بدلیں۔ براق کی جگہ ذوالجناح۔ ماہی مراتب
کے عوض علم اور پنجے۔ بانک پٹے کا فن دکھانے کے بدلے نوحہ خوانی اور سینہ زنی کو رواج
دیا اور شیعوں کو ایک مخصوص تہذیب و تمدن کے ساتھ مستقل قوم بنایا۔ مخصوص لٹریچر پیدا
کیا ان وجوہ سے وہ مجدد مذہب شیعہ کہے جاتے ہیں۔

تاریخ و سیر کی کتابوں میں آئینہ حق نما۔ دوحہ ہاشمیہ۔ نجوم السماء۔ انتصار الاسلام
سبیکۃ الذہب۔ تذکرۃ العلماء۔ ورثۃ الانبیاء وغیرہ کے مصنفین لکھتے ہیں کہ
انھوں نے شب قدر کی مخصوص ساعت میں زیر قبہ حسینی اپنی اولاد میں تاقیامت علم دین
باقی رہنے کی دعا کی تھی جو قبول ہوئی۔ بہر حال یہ اتفاق ہو یا دعا کا نتیجہ۔ واقعہ یہ ہے
کہ کوئی زمانہ اُن کی اولاد کے علمی فیوض سے محروم نہیں رہا آج بھی بڑے بڑے صاحبان علم و فضل
موجود ہیں۔ ہندوستان کے تمام شیعہ علماء اسی خانوادہ کے مائدہ علم کے زلہ چیں ہیں

لکھنؤ کے شیعہ علماء کو فرنگی محل[1] والوں پر ہمیشہ فوقیت حاصل رہی اور آج تک حاصل ہے۔ علمائے شیعہ کے ادبی مذاق نے لکھنؤ کو ادب کی تعلیم کا اعلیٰ ترین مرکز بنا دیا۔[2]

غدر کے بعد مرزا غالبؔ نے میر مہدی مجروحؔ کو ایک خط لکھا ہے جو آگے آئے گا۔ اس خط میں انھوں نے لکھنؤ کی زبان کے مستند ہونے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ وہاں ہر فن کے کامل موجود ہیں۔ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مرزا غالبؔ کے زمانہ کی طرح لکھنؤ آج بھی اہلِ کمال کا مرکز ہے۔ اردو کے مشہور شاعر و انشا پرداز پنڈت برج نرائن چکبستؔ غالبؔ کے چالیس برس بعد لکھنؤ کی یہ حالت بیان کرتے ہیں:-

اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ کی اس مٹی ہوئی حالت پر بھی ایک عالم اس شہرِ مرحوم کے باشندوں کا طرزِ معاشرت اس کی گذشتہ عظمت کی یاد دلاتا ہے اور دل میں ایک دردِ محبت پیدا کرتا ہے۔ ہاں نگاہِ عبرت کا ہونا لازمی ہے۔ میرے دوستو! یہاں کی خاک کو یہ فخر

[1] عہدِ اکبری میں ایک فرانسیسی تاجر نے لکھنؤ میں گھوڑوں کی تجارت میں بڑا فروغ حاصل کیا اور چوک کے قریب چار عالیشان عمارتیں بنوائیں۔ جب اسکی مدت قیام ختم ہوگئی اور دوبارہ اجازت نہ ملی تو یہ مکان نزول سرکار ہوگئے۔ اورنگ زیب کے عہد میں جب ملا نظام الدین سہالوی نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کرنا چاہی تو یہ مکان عطیہ شاہی کے طور پر انھیں دیدیئے گئے۔ جو اپنے گرد و پیش کے مکانات کے ساتھ فرنگی محل کہلاتے ہیں۔ علمائے فرنگی محل انھیں ملا صاحب کی اولاد ہیں جو علمی کمالات کے ساتھ صوفیانہ برکتوں کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔

[2] گزشتہ لکھنؤ صـ۱۰۲ تا ۱۰۳

حاصل ہے کہ میں بھی کبھی امیروں اور شہزادوں کی آنکھوں کا سرمہ تھی۔ یہاں کی عالی شان مگر شکستہ عمارتوں کے ٹوٹے پھوٹے در و دیوار زمانے کے نشیب و فراز کی تصویریں ہیں ؎

ہر کجا خشت کہن بینی درین ویرانہ
ہست فرد دفتر احوال صاحب خانہ[1]

گو کہ یہاں کے شرفاء فلک زدہ ہیں اور زمانے نے ان کے جاہ و جلال کو خاک میں ملا دیا ہے مگر ان میں بوئے ریاست پائی جاتی ہے وہ ایک خاص وضع کے پابند ہیں جس کو وہ آئین شرافت سمجھتے ہیں اور ایک خاص تہذیب کی یادگار ہیں ؎

اسلاف کے کچھ اثر ہیں باقی
اس راکھ میں کچھ شرر ہیں باقی

گو خوار ہوئے ہیں خو وہی ہے
مرجھا گئے پھول بو وہی ہے

ان کی تقریر و گفتگو، شستگی و پاکیزگی کا معیار ہے۔ ان کی نشست برخاست کا طریقہ سلیقہ و امتیاز کا دستور العمل ہے

اہلِ نظر جانتے ہیں کہ اس زوال کی حالت میں بھی لکھنؤ ایک مٹی ہوئی تہذیب کی عبرتناک تصویر ہے جس کا رنگ ابھی بالکل نہیں اڑ گیا ہے باوجود ہزاروں عیوب کے یہاں کے باشندوں کے طرز معاشرت میں اب بھی ایک لطافت موجود ہے جو بیرونجات کے رہنے والوں کو نصیب نہیں زبان کی شستگی طبیعت داری، علو ہمتی، جوہر شناسی، ادب و سلیقہ، حسن تقریر تو گویا شرفائے لکھنؤ کی گھٹی میں پڑی ہے۔ (مضامین چکبست مطبوعہ انڈین پریس الہ آباد سنہ ۱۹۲۸ء صـ۱۴۲)

[1] اس شعر کا پہلا مصرع غلط مشہور ہے صحیح یہ ہے ؎
ہر کجا فتادہ بینی خشتے در ویرانہ

اسی زمانہ کے مشہور مصنف مولانا عبدالحلیم شررؔ تحریر فرماتے ہیں :-
آدابِ معاشرت میں اہم چیز گفتگو و طرزِ کلام ہے - دنیا میں ہر شخص کی شائستگی اور ادبی قابلیت کا پہلا اندازہ اس کے اندازِ گفتگو سے ہوتا ہے - دنیا کی ہر اقبال مند قوم پہلے اپنی زبان کی اصلاح کرتی ہے اور اسے ترقی دیتی ہے -

اس بارہ خاص میں اہلِ زبان لکھنؤ اور یہاں کے شائستہ لوگوں کو جو کمال حاصل ہے وہ ہندوستان کے کسی اور شہر والوں میں نظر نہ آئے گا - اگرچہ موجودہ تعلیم و تہذیب نے ایک حد تک یہ خوبی ہر جگہ اندازِ گفتگو میں پیدا کر دی ہے - انگریزی اثر سے متاثر کر کے دیکھیئے تو بالفات یہ شائستگی و شستگی اہلِ زبان لکھنؤ ہی کا حصہ نظر آئے گی - باہر کے لوگ اس کا یہاں تک لوہا مانے ہوئے ہیں کہ لکھنؤ والوں کے سامنے گفتگو کرتے جھجھکتے ہیں اور جس قدر شائستگی ان میں ہوتی ہے اُس کو بھی بھول جاتے ہیں اس کے بعد جب اپنی صحبتوں میں بیٹھتے ہیں تو یہ کہہ کر اپنی کمزوری کا الزام دور کرتے ہیں کہ ہم سادگی سے صاف صاف باتیں کرتے ہیں اور ہمیں لکھنؤ والوں کی سی چبنیں چناں نہیں آتی مگر دراصل یہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ ہے میں نے ایرانیوں کو دیکھا ان کے سامنے ہندوستانی بات کرنا بھول جاتے ہیں - انگلستان میں دیکھا کہ فرانسیسیوں کے سامنے انگریزوں کی زبان سے ایک لفظ نکلنا مشکل ہو جاتا ہے - اسی طرح عربوں کی طلاقتِ لسانی کی کبھی یہ حالت تھی ان کے سامنے غیر ملک والوں کی زبان کھل نہ سکتی تھی -

یہی حال ہندوستان کے ہر شہر کے مقابل لکھنؤ کا ہے کہ وہ فصاحت و بذلہ سنجی میں سب کو دبا کے صحبت پر چھا جاتے ہیں اور اپنے سامنے کسی کو زبان کھولنے نہیں دیتے -

شائستگی زبان میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ مخاطب کو کن ضمائر سے یاد کیا جائے اور سب زبانوں میں مخاطب کے لئے دو ضمیریں ہیں - ایک واحد کی اور ایک جمع کی اور معزز مخاطب کے لئے واحد کی جگہ ہر زبان میں تعظیماً جمع کی ضمیر استعمال کی جاتی ہے بخلاف ان سب زبانوں کے اردو میں مخاطب کے لئے واحد کی تو ایک ہی ضمیر "تو" ہے مگر جمع کی دو ضمیریں ہیں "تم" اور "آپ" اور ان تینوں ضمیروں کے لئے مخاطب کا درجہ اور مرتبہ مقرر ہے ____________

اردو زبان میں اور خاص لکھنؤ والوں میں مخاطب کے اتنے ہی درجے نہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کے بہت سے الفاظ ہیں ____________
جو لکھنؤ والوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں اور ان کا صحیح استعمال جس قدر اہلِ لکھنؤ جانتے ہیں کسی دوسرے شہر کے لوگ نہیں جانتے ____________

مزاج پرسی کو دیکھیئے ہر زبان میں اس کے لئے معمولی الفاظ ہیں مگر اردو میں ادب و احترام کی نگہداشت کے لیے مزاج عالی - مزاج مبارک، مزاج اقدس، مزاج معلی وغیرہ کہہ کے معزز مخاطب کی خیریت دریافت کرتے ہیں - یہ الفاظ اگرچہ اب ترقی اردو کے ساتھ ہر جگہ اور ہر شہر میں پھیل رہے ہیں مگر ان کے استعمال میں جو اجتہادی ملکہ شرفائے لکھنؤ کو حاصل ہے کسی اور جگہ کے لوگوں کو

نصیب نہیں ہو سکتا۔

شرفائے لکھنؤ میں ایک خاص بات یہ ہے کہ "ش" "ق" درست رہے گا اور تمام عربی حرفوں کو حتی الامکان ان کے مخرج سے ادا کریں گے فارسی ترکیبوں میں اضافت نمایاں طور پر ادا کی جائے گی۔ علماء اور ذی علم لوگوں سے باتیں کریں گے تو عربی اور فارسی کے الفاظ کو زیادہ استعمال کریں گے اور ان کے صحیح تلفظ سے ادا کریں گے۔ اطباء سے گفتگو ہوگی تو عربی کے طبی مصطلحات کو کام میں لائیں گے جاہل نوکروں اور عوام سے بات کریں گے تو عربی الفاظ سے بچیں گے عورتوں سے بات چیت ہوگی تو ان کے مذاق کے محاوروں اور مثلوں کو گفتگو میں صرف کریں گے۔ خورد بزرگ سے ادنیٰ اعلیٰ سے یا عامی عالم سے گفتگو کرے گا تو ہر لفظ اور ہر فقرہ میں ادب و تعظیم کا خیال رکھے گا آواز مناسب درجہ تک پست نیچی رہے گی اسی طرح بزرگ خوردوں سے اعلیٰ طبقہ والے ادنیٰ لوگوں سے علماء عوام سے بات کریں گے تو انکے لہجہ انکے الفاظ میں شفقت و محبت کے جذبات مضمر ہونگے۔

ان باتوں کا لحاظ رکھنے اور مذکورہ بالا ادب و تعظیم کے الفاظ وضمائر استعمال کرنے سے اہل لکھنؤ کی زبان اس قدر شستہ اور رفتہ ہوگئی ہے کہ یہاں کے عوام اور جہلا دوسرے شہروں کے اکثر شعراء و فصحا سے زیادہ اچھی اردو بولتے ہیں اور جو شائستگی و تمیز داری ان سے ظاہر ہو جاتی ہے کسی اور مقام کے قابل و ذی علم لوگوں سے بھی نہیں ہو سکتی[1]

[1] اس موقع پر مجھے اپنا ایک واقعہ یاد آگیا ہے جس کا لکھ دینا (باقی اگلے صفحہ پر)

آدابِ معاشرت میں دوسری چیز طریقہ مذاق ہے ——

جو زبان جتنی زیادہ ترقی کرتی ہے اسی قدر اس میں مذاق و ظرافت کے پہلو بڑھتے جاتے ہیں ——

اس کا جیسا اچھا سلیقہ لکھنؤ کے عوام الناس کو ہے دوسری جگہ کے خاص لوگوں میں نظر نہیں آتا ——

پہلے صفحہ کا حاشیہ :۔ لطف سے خالی نہیں

جونپور میں ہمارے ایک کرم فرما انگریزی میں ایم اے۔ اردو سے دلچسپی رکھنے والے شاعری کے خاندانی مدعی شرافت و سیادت کے یقینی مالک ہیں میں جونپور میں ایک کتب فروش کی دوکان پر کھڑا تھا۔ ہاتھ میں ہندی کا اخبار تھا جس کی تہ میں ایک تصویر تھی اتنے میں ہمارے دوست بھی آپہنچے اخبار کو دیکھ کر فرمایا "آپ سمجھ لیتے ہیں"۔ میں نے مسکرا کر کہا کہ تصویر کی حفاظت کے لئے پورا اخبار لے لیا ہے ورنہ اتنا سمجھدار نہیں ہوں اس جواب سے وہ کچھ جھینپ سے گئے اور مجھے اپنے اس بے ساختہ جواب پر افسوس ہوا۔ مگر چارہ ہی کیا تھا تیر کمان سے نکل چکا تھا ابھی وہ بیٹھے ہی تھے کہ اتفاق سے ایک لکھنوی سے ملاقات ہوگئی یہ ایک معمولی درجہ کے آدمی تھے عینکیں بیچتے تھے مجھے دیکھ کے اس دکان پر آگئے۔ خیریت و مزاج پرسی کے بعد ہندی کا اخبار میرے ہاتھ میں دیکھ کر فرمانے لگے۔ ماشاءاللہ ہندی سے بھی آپ کو ذوق ہے"۔ ان کے اس فقرہ میں استفہام کی شان نہ تھی بلکہ اظہار واقعیت کا انداز تھا۔ یعنی ایسا ہی حالانکہ ان کا مقصود بھی یہی دریافت کرنا تھا کہ تم ہندی جانتے ہو یا نہیں۔ لیکن نہ جاننے کی نسبت میری طرف دینا اپنی تہذیب کے خلاف سمجھے اور اس کو اس حسن سے پوچھا۔ انھیں خوبیوں نے لکھنؤ کو تہذیب و شائستگی کا مرکز بنا دیا۔

اہل لکھنؤ میں شوخی و ظرافت بہت ہے وہ اپنے کلام میں صدہا عنوانوں سے ظرافت پیدا کر دیا کرتے ہیں اور جو اس فن میں جتنا زیادہ کمال رکھتا ہے اتنا ہی زیادہ اہل سخن کی محفلوں میں چمکتا اور ممتاز ثابت ہوتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اور مقامات کے لوگوں میں یہ ملکہ نہیں ہے اور کثرت سے ہے

مگر لکھنؤ والوں میں یہ ملکہ طبیعت ثانویہ بن کے ان کی فطرت اور جبلّت بن گیا ہے اور لطافت کلام کے ساتھ بذلہ سنجی و ظرافت میں جیسا بے تکلف اور ستھرا مذاق ان کا نظر آئے گا اوروں کا نہیں ہو سکتا۔ گزشتہ لکھنؤ ص۲۸۰ تا ۲۹۶

محمد تقی صاحب ایم۔ اے نے حال میں ایک کتاب واجد علی شاہ کے حالات میں لکھی ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:۔

ایک انگریز خاتون نے جس کا قیام عرصہ تک لکھنؤ میں رہا ہے لکھنؤ والوں کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ یہ نہایت متمدن اور مہذب ہیں۔ ان کی گفتگو نہایت شائستہ ہے واقعہ یہ ہے کہ لکھنؤ والوں کا مذاق نہایت شستہ اور ان کی گفتگو اور لہجہ اپنی خاص خصوصیات رکھتا ہے اکثر جاہل عوام بھی ایسی زبان بولتے ہیں کہ دوسری جگہ کے مہذب اور تعلیم یافتہ اس قدر خوش اسلوب بیان کو سن کر آفریں اور تحسین پر مجبور ہو جاتے ہیں شاعری اور ادبی خوبیاں لکھنؤ والوں میں سرایت کر گئی ہیں جسکی وجہ یہ ہے کہ نوابی حکومت کے عیش و عشرت نازک خیالی اور نفاست مزاجی نے عوام کو بھی اس رنگ میں رنگ دیا۔ مثلاً ہر شخص شدید طبع آزمائی کرنے لگا تھا

ادنیٰ طبقہ کے لوگ یہاں تک کہ گھر میں بیٹھنے والی عورتیں تک ادبی نزاکتیں اور شاعرانہ تخیل کو سمجھنے اور داد دینے کی عادی ہو گئی تھیں۔ جہلاء کی زبان بھی اتنی ستہ کہ دوسرے مقامات کے لوگ تعجب کرتے تھے اخلاقی حفظ مراتب اور تمدنی آداب جو لکھنؤ کی معاشرت کے خصوصیات تھے اُن کا تحرّ گفتگو میں پورے طور پر پایا جاتا تھا۔ عورتوں کی زبان دلنشین ہونے کی وجہ سے مردوں کی زبان سے بہت کچھ مختلف تھی۔ علاوہ اس کے بیگماتی زبان میں ادبی اور شاعرانہ نزاکتیں بھی بھری ہوئی تھیں بقول شاعر ؎

زباں کے خلد کی ہے حور عورت — اگر ہو لکھنؤ کے بوستاں کی

لکھنؤ کی اس اعلیٰ تہذیب اور معاشرت نے اتنی ترقی کی ضرب المثل بن گئی۔ کسی کے متعلق اتنا کہہ دینا کہ وہ لکھنؤ کے رہنے والے ہیں گویا یہ کہنا ہے کہ مجسم ادب و شائستگی ہیں۔ اس زمانہ کے زندہ مصنف پروفیسر اعجاز حسین صاحب اعجاز اپنی کتاب مختصر تاریخ ادب اردو میں لکھنؤ کے مشہور شاعر و انشا پرداز حضرت ناصری کے حالات میں لکھتے ہیں۔

تہذیب و شائستگی کے متعلق غالباً اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ آپ لکھنؤ کے رہنے والے تھے"۔

مولانا عبدالحلیم شرر لکھنؤی ادبی صلاحیتوں کے ذیل میں لکھتے ہیں:۔

ان آخری دوروں پر نظر غائر ڈالنے سے صاف نظر آجاتا ہے کہ فصاحت زبان اور شاعری نے لکھنؤ میں ایسی مضبوط جگہ پکڑ لی تھی کہ چند

ہی روز میں شعر کہنا لکھنؤ میں ایک وضع داری بن گیا۔ شعراء کی یہاں اس قدر زیادتی ہوگئی کہ شاید کہیں کسی زبان میں نہ ہوئی ہوگی۔ عورتوں تک میں شعر و سخن کا چرچا ہوا اور جہلا کے کلام میں بھی شاعرانہ خیال آفرینیوں تشبیہوں اور استعاروں کی جھلک نظر آنے لگی [1]

جاہلوں کے کلام میں تشبیہ و استعارے کی جو مثالیں مولانا شرر نے لکھی ہیں ان میں سے ایک مثال یہ ہے:۔

ایک کبڑیا چوک میں پونڈے بیچ رہا تھا۔ صدا یہ تھی "ارے بھئی یہ کنکوے کون لوٹے گا۔"

میں نے یہ مثال ایک جگہ کے نہایت نکتہ رس، بذلہ سنج اور پاکیزہ مذاق شخص سے بیان کی جن کی سخن فہمی کی وہاں دھاک ہے تو وہ لکھنؤ کے اس کبڑیے کی بات نہ سمجھ سکے حالانکہ یہ سودا بیچنے والے کی لفظیں تھیں جنہیں لکھنؤ کا ہر بچہ سمجھتا تھا۔ جب میں نے مطلب بتایا تو بڑی تعریف کی اور دیر تک لطف لیتے رہے۔ اس واقعہ سے مولانا شرر کے اس قول کی تصدیق ہوگئی کہ جو ادیبانہ صلاحیتیں لکھنؤ کے عوام سے ظاہر ہوتی ہیں وہ دوسری جگہ کے خواص کی سمجھ سے باہر ہیں۔ واقعی کس قدر نازک استعارہ ہے کہ نہ پونڈے کا نام لیا نہ لگے کا جس سے کنکوے لوٹے جاتے ہیں صرف اتنا کہہ کے کنکوے کون لوٹے گا یہ بتا دیا کہ یہ پونڈے لگّوں کے برابر ہیں جن سے کنکوے لوٹے جاتے ہیں۔

نواب نصیر حسین خاں خیال لکھتے ہیں:۔

شیخ جان محمد شاد (مشہور شاعر لکھنوی) مرحوم ناقل تھے کہ غدر کے زمانہ میں جب یارد لکھنؤ میں رہتا تھا۔ فرور تاً ایک صبح کو قیصر باغ

کی طرف آنا پڑا۔ انگریزوں اور باغیوں کی فوجیں پڑی تھیں۔ بیلی گارد کا محاصرہ تھا۔ اس طرف جانے لگا۔ ایک بھنگی ہاتھ میں جھاڑو لئے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ میاں صاحب جان کی خیر مناؤ ادھر نہ جاؤ۔ میں نے کہا کیا خبر ہے؟ جواب دیا گورے کمک کو آپہنچے ہو لاک اور جنرل ارم بھی آہی چاہتے ہیں اور کیا کہوں ؎

لکھنؤ میں کوئی قبل کوئی بعد آئیگا | گیتی بے گی جب عمر سعد آئے گا

جہاں بھنگیوں کا ادب و مذاق اتنا درست ہو گیا ہو وہاں کے شائستہ کیسے ہوں گے؟

موجودہ لکھنؤ اور ادب و شاعری

لکھنؤ کی یہ خصوصیتیں ابھی باقی ہیں [1]

کسیکہ محرم باد صباست می داند | کہ باوجود خزاں بوئے یاسمن باقی ست

شعر کہنا اب بھی لکھنؤ والوں کی وضع میں داخل ہے اور شاعروں کی اتنی کثرت ہے کہ شاید کہیں نہ ہو۔ عورتوں میں شعر و سخن کا چرچا ہے اور جاہلوں کی بات چیت میں ادبی لطافت پائی جاتی ہے۔ شاعرانہ حیثیت سے اس دور کے کارنامے اردو ادب کی تاریخ میں بڑی اہمیت سے دیکھے جائیں گے۔

اصناف سخن میں۔

غزل نظم۔ رسوا۔ جاوید، آرزو، صفی، ثاقب، عزیز، آثر اور محشر کی غزلوں میں جذب و اثر کی ایک دنیا آباد ہے۔ حکیم ابو العلا ناطق حکیم سید علی آشفتہ، حکیم منے آغا فاضل، حکیم منے آغا آفتاب۔ حکیم فدا احمد دانش۔ شیخ مہدی حسین ناصری۔ مولوی اولاد حسین شاعر۔ سید منیر آغا اشہر

[1] حاشیہ داستان اردو ص ۱۲۷

سید جعفر حسین منظر۔ سید نواب افسر۔ سید مجاور حسین تمنّا۔ قدیر احمد خاں قدیر۔ محمد صاحب بہار۔ فریدون مرزا مجروح۔ تصدق حسین شمس۔ سردار حسن بہزاد۔ نبی صاحب راز۔ محمد رضی شگفتہ، منے آغا راز۔ حسن اختر، بھگت منشی رام سہائے تمنّا۔ سید آل رضا رضا۔ سراج الحسن سراج۔ نبن صاحب راز۔ پنڈت کشن نرائن در۔ پنڈت آنند نرائن ملا۔ بتن صاحب ثروت، منشی بشیشر پرشاد منور ایسے خوش فکر غزل گویوں کا جھرمٹ دوسرے شہر میں نہیں مل سکتا۔

قصیدہ | صفی، عزیز اور محشر کے قصیدوں کا مثل زمانہ مشکل سے پیش کرے گا۔

نظم | صفی، عزیز۔ اثر اور جوش کی نظمیں اپنی دل کشی اور اثر انگیزی کے لحاظ سے اس دور کا مخصوص کارنامہ ہیں۔

مرثیہ | مرثیہ گوئی میں اس دور کے مرثیہ گو رشید۔ عروج، اوج، عارف، جاوید، کامل، ماہر، فاخر، ذاخر، حسین ایسے صاحب کمال تھے جن کا مثل اب پیدا ہونے کی امید نہیں۔

زندہ مرثیہ گویوں میں فائق، فائز، رفیع، ذکی، مودب، آشفتہ، رضا، خبیر، شدید۔ فرید، ثمر ایسے اساتذہ فن ہیں جن پر لکھنؤ کی خاک کو آج بھی ناز ہے۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ عربی و فارسی کے معلم مولانا سید علی زینبی نے میرے سامنے یہ واقعہ بیان کیا کہ مولانا شبلی ایک مرتبہ اوج و عروج جانشینان دبیر و انیس کی مجلس مرثیہ خوانی میں شریک ہوئے تو فرمایا کہ لکھنؤ میں آج بھی انیس و دبیر زندہ ہیں۔ مولانا شبلی ایسا سخن سنج

ولقادِ فن لکھنؤ کی موجودہ مرثیہ گوئی پر یہ رائے رکھتا ہے اس سے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کیجیے

ظریفانہ شاعری | سید مقبول حسین ظریف کی مزاحیہ نظمیں ایک غیر فانی کارنامہ ہیں آج بھی چھوٹے بڑے متعدد مزاحیہ گو شعراء موجود ہیں جن سے مشاعروں میں اچھی خاصی زندہ دلی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

ان پڑھ شعراء | ان پڑھ شعراء میں احمد حسین عرف ننھو صاحب شفیق اور صادق حسین عرف جھنگا صاحب حسین کا نام ادب اردو کا مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔

عورتوں کی شاعری | عورتوں میں بھی شعر و سخن کا چرچا ہے انیس کے مرثیوں نے عورتوں میں سخن فہمی کی بہت صلاحیت پیدا کر دی ہے۔ بہت سی عورتوں کے نوحوں کے مجموعے چھپ چکے ہیں۔ فنی حیثیت سے ناول وغیرہ کہنے میں کنیز فاطمہ حیا نے آج کل بہت شہرت حاصل کی ہے۔

یہ ان شاعروں کا ذکر ہے جو خاصی شہرت رکھتے ہیں لیکن اگر کسی امتیاز کو مد نظر نہ رکھ کے صرف شاعر شماری کی جائے تو لکھنؤ کے ہر گھر میں دو چار شاعر ملیں گے۔ اسی طرح ادب کے اور شعبوں میں اہل لکھنؤ کے کارنامے ہندوستان کے تمام شہروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔

ناول اور ڈرامہ | ناول اور ڈرامہ نویسی میں ڈاکٹر مرزا محمد ہادی رسوا۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ مولانا عبدالحلیم شرر۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ منشی جوالا پرشاد برق، پنڈت کشن پرشاد کول۔ سید مہدی حسن احسن سید انور حسین آرزو۔ محمد علی طیب۔ ملک کے بہترین ناول نگار اور ڈرامہ نویس ہیں

لغت

اردو لغت کی پرانی کتابیں یعنی میر علی اوسط رشک کی نفس اللغہ
مرزا محمد مرتضیٰ عاشق کی بہار ہند، حکیم ضامن علی جلال کی سرمایہ زبان اردو،
منشی امیر احمد امیر مینائی کی امیر اللغات اگرچہ ایسی کتابیں ہیں جو اسناد
واعتبار اور نوعیت میں بے مثل ہیں۔ لیکن موجودہ لکھنؤ کے موضوع
سے خارج ہیں ہاں اس موقع پر منیر لکھنوی کی منیر اللغات، منیر البیان
محاورات، ہندوستان، بازاری زبان، لغات سعیدی، گنجینۂ اقوال
وامثال اور عزیز لکھنوی کی عزیز اللغات اور پروفیسر ادیب کی فرہنگ
امثال کا ذکر ناموزوں نہ ہوگا لیکن دنیائے لغات کا تازہ بتازہ
شاہکار منشی نور الحسن نیر بی۔ اے۔ ایل ایل بی۔ کی نور اللغات
ادب اردو میں ایک قابل قدر اضافہ ہے

مزاحیہ نویسی

مزاحیہ نویسی میں مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، پنڈت
رتن ناتھ سرشار، منشی سجاد حسین اور شیخ ممتاز حسین
کے اسمائے گرامی تاریخ کے صفحوں پر ہمیشہ آفتاب کی طرح چمکتے رہینگے

تاریخ اور تنقید

پنڈت برج نرائن چکبست۔ مولانا عبد الحلیم
شرر۔ خان بہادر نواب مرزا جعفر علی خاں اثر۔
شیخ ممتاز حسین ایڈیٹر (اودھ پنچ) کے تاریخی اور تنقیدی مضامین
بڑی وقعت رکھتے ہیں۔

ادبی کتابیں

شیخ مہدی حسین ناصری ایم۔ اے۔ سید منیر آغا اشہر
ایم اے۔ مرزا محمد عسکری بی۔ اے۔ مولوی
امیر احمد علوی۔ بی۔ اے۔ سید افضل حسین ثابت۔ مولوی حکیم
عبدالحئی، مشیر احمد علوی، خواجہ عبدالرؤف عشرت کی ادبی کتابیں

نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔

شارحین

علامۃ الادب مولانا علی حیدر نظم طباطبائی کی شرح دیوان غالب
اور مولوی محمد نقی شادمان کی شرح قصائد خاقانی کو اہل نظر
نے تمام شرحوں سے بہتر تسلیم کرلیا ہے۔

تحقیقی کتابیں اور ترجمے

ڈاکٹر مرزا محمد ہادی رسوا پی۔ ایچ۔ ڈی کے
فلسفے کی کتابوں کے ترجمے اور پروفیسر
مسعود حسن ادیب ایم اے کی تحقیقی کتابیں اور مقالے ادب اردو کے لئے
ہمیشہ افتخار کا سرمایہ رہیں گے

مذہبی کتابیں

علمائے شیعہ کے سید و سردار حضرت مولانا علی نقی صاحب
کی تصنیفیں حدیث و تفسیر۔ تاریخ و تنقید۔ فقہ و
اصول کلام و مناظرہ میں نظر کی وسعت۔ تحقیق کی کاوش، استدلال
کی متانت، تحریر کی سنجیدگی میں اس صدی کا ایک عظیم الشان
کارنامہ ہیں۔

عوام کی شاعرانہ صلاحیت

آج بھی لکھنؤ کے جہلا جس شاعرانہ
انداز میں بات کرتے ہیں دوسری
جگہ علماء نہیں کرسکتے۔ جب برسات میں جامن بیچنے والا اپنی مترنم آواز
میں کہتا ہے:۔ "کالی گھٹا کے کالے بھلیند ے"
تو ہزاروں شعر نثار کردینے کو جی چاہتا ہے اور گرمیوں میں برف
کی قفلی بیچنے والے کا یہ کہنا:۔
"محبت میں گھل رہی ہے"
اپنے اندر جذب واثر کا ایک عالم رکھتا ہے۔ گنڈیریوں

والے کی آواز:-

"برفی کی ڈلیاں کون لے گا"

بلاغت کی جان ہے اور گولر بیچنے والے کی صدا:-

"گولر کیا ہے شہد کی کپیاں ہیں"

بیر بیچنے والے کی آواز:-

"یہ پیوندی بیر ٹکے سیر"

پان بیچنے والے کا یہ مصرع-

"کرتی ہے سرخ رو وہ گلوری ہے پان کی"

دماغ کی ادبی اور شاعرانہ ساخت کا پتہ دیتا ہے۔ اسی شاعرانہ صلاحیت نے لکھنؤ کے عوام میں ظاہر ہو کے معاشرت کی تمام چیزوں میں کیسی کیسی خوبیاں اور دلفریبیاں پیدا کر دی ہیں اور ادب و اخلاق میں ان کا معیار اتنا بلند کر دیا ہے کہ جب وہ کسی سے گفتگو کرتے ہیں تو لہجہ الفاظ اور انداز اس کی حیثیت اور مرتبہ کے ایسا موافق ہوتا ہے کہ نکتہ شناس پھڑک جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جہاں کے جاہل ایسے ہوں وہاں کے خواص کا کیا ذکر جن کی مجلس ادب میں بے تحاشا ہنسنا۔ بے باکی سے بولنا۔ بے قرینہ بیٹھنا، منہ کھول کے جماہی لینا۔ بے منہ پر رومال رکھ کے چھینکنا۔ منہ کے سامنے آڑ کئے بغیر تھوکنا۔ بیہودہ مذاق کرنا۔ بازاریوں کی لفظیں (لونڈا، لپاڑ، چانٹا وغیرہ) بولنا۔ غرض ہر نا سنجیدہ بات آئین ادب کے خلاف ہے۔ آپ اپنے دل میں کہتے ہوں گے کہ یہ قیافہ تو بہت مغرور خشک مزاج لوگوں کا ہے مگر ان کے چہرے معتدل تبسم سے شگفتہ جبینیں اخلاق کی وسعت سے کشادہ آنکھیں بردباری

سے نیچی گردنیں خاکساری سے جھکی باتیں قند و نبات لہجہ آبِ حیات شاد عظیم آبادی انہیں کی تصویر کھینچی ہے:-

وہ صورتیں ہر ایک وہ ان کی شان و شکوہ
مہذبانہ وہ باتیں وہ جاں فزا گفتار

ہر اک کو وضع کا پاس اپنے دوستوں کا لحاظ
لبوں پہ خلق کی باتیں دلوں میں صبر و قرار

وہ دوستوں سے عزیزوں کی طرح مل جانا
برائیوں سے کنارا شکایتوں سے عار

نہ نکلیں گھر سے جو نکلیں تو شان سے نکلیں
کہ اپنے ہاتھ سے جانے نہ پائے اپنا وقار

لٹے دیے ہوئے اور آبرو بنائے ہوئے
کہ تا نہ سمجھے کوئی ان کو مفلس و نادار

مہذب ایسے تھے جاہل بھی اس زمانے کے
کہ اہل علم میں کرے زمانہ ان کا شمار

محاوروں میں وہ شیرینیاں کہ صلِّ علیٰ
وہ جب کریں تو بآہستگی کریں گفتار

جھکائے سر کو شرافت سے راستہ چلنا
ادب سے ہاتھ اٹھانا سلام کو ہر بار

کریں غریب کا بھی تابفرش استقبال
بہت لحاظ کہ آئے نہ ان کے دل پہ غبار

بہادرانہ امنگیں سپاہیانہ شوق
جریب دستِ مبارک میں اور کمر میں کٹار

کوئی جگہ کوئی صحبت نہیں کہ ہوں نہ یہاں
مورخ و شعراء و ادیب و نثر نگار

اسی تصویر کا ایک رخ مولانا قتفی نے یہ پیش کیا ہے:-

لکھنؤ اے اوجِ ہمت کے ستارے لکھنؤ
لکھنؤ اے ہند کی آنکھوں کے تارے لکھنؤ

خلق کے جوہر چمکتے ہیں تری اکسیر میں
جذبِ دل کا مادہ ہے خاک دامن گیر میں

و دل و لہجہ نہ ہو گوشِ سماعت پر جو بار
روزمرہ وہ کہ جو حسنِ ادا سے ہمکنار

لکھنؤ کے ہر کہ و مہ کی زباں نرم و صاف
ہے درست اسکے عوام الناس کا بھی شین قاف

لکھنؤ کا طبقۂ انقاز تک شیریں کلام
روزمرہ وہ فصیح ان کا وہ فراشی سلام

لکھنؤ اک خطۂ آباد و مردم خیز ہے
جو یہاں پیدا ہوئے ہیں ذہن ان کا تیز ہے

بیشتر موزوں طبیعت بیشتر نازک خیال   خوش مزاج و خوش دماغ و خوش لباس و خوش مقال
لکھنؤ کے خاص باشندے مرنجان و مرنج   نکتہ فہم و نکتہ رس، ہنس مکھ، ظریف و بذلہ سنج
پائیگا عامیوں کو بھی مہذب نکتہ رس   واقف آداب مجلس باخبر با حس و مس

معاشرت کی یہ دل فریبیاں آپ کو کہاں ملیں گی۔ انھیں باتوں نے لکھنؤ کو اہل دل کی جنت بنا دیا ہے اور کہنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے

کہاں ہوں گی امیرؔ ایسی دائیں حور و غلماں میں
رہے گا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں

اور ناسخؔ تو بہشت میں بھی لکھنؤ کو یاد کر کے چونک پڑتے ہیں ہے

گو ملی جنت بھی رہنے کو بجائے لکھنؤ
چونک پڑتا ہوں میں ہر دم کہہ کے ہائے لکھنؤ

اودھ کے مشہور فارسی داں رئیس راجہ درگا پرشاد لکھتے ہیں کہ عارف علی شاہ عارف محمد شاہ بادشاہ ایران کے عمائد سلطنت میں بڑے پائے کے شاعر تھے۔ انھوں نے جوانی میں دنیا ترک کر کے سیاحت اختیار کی۔ ہندوستان کے شہروں میں لکھنؤ اس قدر پسند آیا کہ اکثر یہیں رہا کرتے تھے اور کہتے تھے ہے

بہ ہندوستان ندیدم موضعے دلچسپ چوں لکھنؤ
اگر چہ در طریق سیر تا چینا چیں رفتم [1] (بوستان اودھ)

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ نے غدر کے بعد جب ہندوستان کی زمین اپنے فرزندوں کے خون سے لال اور ظلم و ستم کی آندھیوں سے سیاہ ہو رہی تھی تباہی اور بربادی کے شعلے ہر طرف بھڑک رہے تھے۔ ہر شخص

اپنے حال میں مبتلا تھا۔ باپ بیٹے کی اور بیٹا باپ کی خبر نہ لے سکتا تھا۔ ایسے قیامت خیز وقت میں وہ اپنے دوست مرزا حاتم علی بیگ مہرؔ کو ایک خط لکھتے ہیں جس میں لکھنؤ کی حالت یوں تڑپ کے پوچھتے ہیں۔

ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گزری [1]

یہ کسی ایسے ویسے کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ غالبؔ شاعر اور علما جہاں آباد کا باشندہ، آپ جانتے ہیں کون شاہجہاں آباد؟ اطبا کا یونان، شعراء کا اصفہان، فقہا کا بغداد، محدثین کا بخارا، راجگان ہند کی حشمت کی یادگار، آل تیمور کی عظمت کا سرمایہ دار، سطوت اسلامی کی منزل، ہندوستان کا دل، شاہجہاں کا بنایا ہوا ارم، علم و ہنر کا سجایا ہوا فردوس جس میں شاعری اور زبان آوری کے کوثر و سلسبیل لہریں مارتے تھے۔ اسی جنت ارضی کے رہنے والے ہندوستان کے شاعر اعظم "رشک عرفی و فخر طالب" اسد اللہ خاں غالبؔ کے دل میں لکھنؤ کی یہ عظمت کیوں ہے اسے سمجھئے!

حقیقت یہ ہے کہ یہ علم کا عروج، ہنر کی ترقی، تہذیب کی بلندی، تمدن کی نزاکت اور معاشرت کی لطافت ہے جس نے لکھنؤ کو اس قابل بنا دیا ہے کہ جنت کے رہنے والے بھی خاک کے اس خطہ کی بہار پر لہلوٹ ہیں۔

---

[1] ادبی خطوط غالب

ایک شبہ کا ازالہ اور زبان کی ترقی کے اصول

ممکن ہے کسی کو یہ خیال ہو کہ ان باتوں سے زبان کو کیا تعلق ؟ اس لئے بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہر زبان کی ترقی بلکہ زندگی - اس کی لفظوں ، ترکیبوں اور اسلوبوں کے تغیر و اصلاح پر منحصر ہے اور یہ کام انہیں لوگوں کا ہے جن کی طبیعت میں پاکیزگی، نفاست اور لطافت کا جوہر موجود ہو، اردو کی کھیتی کو آبِ حیات سے سینچنے والے حضرت آزاد دہلوی لکھتے ہیں :-

ہر زبان کے فصحا کا قاعدہ ہے کہ اپنی زبان میں تصرفاتِ لطیف سے کچھ ایجاد کر کے نئے الفاظ اور اصطلاحیں پیدا کرتے ہیں ۔ ان اصطلاحوں کی بنیاد اگرچہ اتفاقی پڑتی ہے مگر ان لوگوں کی طبیعت سے ہوتی جو علم کے ساتھ فکرِ عالی ۔طبیعت براق ذہن پر ایجاد اور ایجاد دلپذیر رکھتے ہیں ۱؎

سید مہدی حسن صاحب احسنؔ لکھتے ہیں :-

فصاحت ایک مقولہ کیفی ہے اور کیفیت کا احساس انھیں لوگوں کو خوب ہو سکتا ہے ۔ جن کی باریک بیں نظر نزاکت زبان کو محسوس کر سکتی ہو ۲؎

لکھنؤ والوں میں یہ صفتیں، پورے کمال کے ساتھ موجود ہیں ۔ انھوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں وہ تکلف اور جدت پیدا کی کہ دنیا دنگ ہو گئی ہم تفصیلات میں نہیں پڑنا چاہتے ع این رشتہ بانگشت نپیچی کہ دراز است تفصیلی اطلاع حاصل کرنے کے لئے گزشتہ لکھنؤ، شباب لکھنؤ اور

۱؎ آب حیات ص۱۸ ۲؎ گل رعنا ص۳۳۹

بہار ستان اردو کا مطالعہ کرنا چاہیئے ۔ مولانا حکیم عبد الحئی مرحوم لکھتے ہیں :-

وضع قطع، لباس، خورد و نوش اور طرز ماندو بود غرض کہ زندگی کے ہر شعبہ میں تراش خراش نے نئے نئے انداز پیدا کر دیئے ۔ اس طرح ہر چیز بر قیاس کرو زمین نئی آسمان نیا ہو گیا ۱؎

مولانا اظہری فرماتے ہیں -

لکھنؤ دلی کے بعد دوسرا شہر تھا جس نے اپنی تراش خراش اور ہر اور ہر قسم کی نفاست اور لطافت میں اپنے آپ کو روشناس آفاق کر رکھا تھا شاعری کے متعلق رام بابو سکسینہ کا بیان ہے ۔

شعر گوئی کا اتنا چرچا پھیلا کہ جا بجا مشاعرے ہونے لگے، امراء اور عوام الناس بھی شاعری سے دیوانے تھے، عمدہ اشعار پڑھ کر اور سن کر لوٹ جاتے تھے ۔ مشاعرے کی محفلیں ماہوار سے ترقی کر کے بعض جگہ روزانہ ہوتی تھیں ۔ جس میں شعراء اپنی عمدہ عمدہ غزلیں پڑھتے تھے ۔ اور سامعین کی طرف سے ان کے دل بڑھتے تھے ۔ اس مقابلہ سے یہ فائدہ ضرور تھا کہ علاوہ کلام کی کثرت کے ایک دوسرے پر فوقیت لیجانے کی کوشش کرتے تھے اور یہی فوقیت اور سرسبزی کا خیال لوگوں کے لئے مایۂ ناز تھا ۲؎

یہ ذوق ترقی کرتے کرتے اس حد پر پہونچ گیا کہ بقول حضرت شررؔ عورتوں میں بھی اس کا چرچا ہوا ۔ اور عوام کی باتوں میں شاعری کی جھلک نظر آنے لگی اور سچ پوچھئے تو در و دیوار سے شعر برسنے لگے ۔ شادی و غم کے

۱؎ حیات انیس ص۱۲۹ ۲؎ تاریخ ادب اردو ص۳۵۹ تا ۳۷۰

رقعے محفل و مجلس کے دعوت نامے تک شعر میں ہونے لگے۔ انتہا یہ ہو گئی کہ اخبار تک نظم میں نکلنے لگا۔[1] جس کی مثال شاید دنیا میں کہیں نہ ملے۔ بعضوں نے بات چیت تک شعر میں شروع کر دی۔ اس وقت بھی ایک بزرگ ہیں[2] جن کی گفتگو کا زیادہ حصہ نظم میں ہوتا ہے۔ اس چیز نے اتنی ترقی کی کہ یہاں کی فضا اس کے لئے سازگار سمجھا جانے لگا۔ مولانا ابوالحسن بھوپالی کا ایک خط حضرت محوی صدیقی کے نام ۱۹۱۳ء کا لکھا ہوا مرقع ادب حصہ اول میں شائع ہوا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں :۔

لکھنؤ کے قیام نے آپ کی زندگی میں کوئی انقلاب نہیں کیا وہی انجمادی کیفیت وہی خود فراموشی

ایک دو دن نہیں آپ کو لکھنؤ گئے ہوئے چار مہینے ہوتے ہیں۔ مگر اب تک نہ کوئی نظم نہ کوئی مضمون[3]

---

[1] اس اخبار کا نام نظم الاخبار تھا جو منشی دوارکا پرشاد افق کی ادارت میں نکلتا تھا۔ منشی جی اردو فارسی میں اچھی خاصی دستگاہ رکھتے تھے اور نظم و نثر دونوں پر قادر تھے۔ ان کی پرگوئی پر خود ان کا اخبار شاہد ہے۔ بہت زمانہ کی بات نہیں افق کو انتقال ہوئے ابھی بیس برس بھی نہیں ہوئے یعنی ۱۱ دسمبر ۱۹۱۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔

[2] آپ کا نام کاظم حسین تخلص مقدس ہے۔ خاندانی نواب زادے ہیں۔ گورنمنٹ سے وظیفہ ملتا ہے۔ عربی فارسی کی تحصیل کی ہے۔ اس وجہ سے بجائے نواب کے مولوی کہے جاتے ہیں۔ فنون سپہ گری میں کمال حاصل ہے۔ وکٹوریہ اسٹریٹ میں افضل محل کے سامنے مکان ہے۔ نہایت مقدس متواضع منکسر مزاج پاک طینت بزرگ ہیں۔ پچاس ساٹھ کے درمیان عمر ہے اور اب تک طالب علم ہیں۔ ۱۲

[3] مرقع ادب حصہ اول شریف زادہ ناول ص ۱۶۵

ڈاکٹر مرزا محمد ہادی مرزا پی ایچ ڈی تحریر فرماتے ہیں :۔

کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ کے رہنے والے موزوں طبع ہوتے ہیں۔ اصل سبب سوسائٹی ہے نہ کہ طبیعت لکھنؤ کی سوسائٹی میں اس قابلیت کے ظاہر ہونے کے اسباب پیدا ہو گئے ہیں۔ یہی سوسائٹی کی شاعرانہ قابلیت تھی۔ جس نے زبان میں ایسی خوبیاں پیدا کیں جن پر اہل ذوق ہمیشہ تحسین و آفرین کے پھول برساتے رہیں گے۔

رام بابو صاحب سکسینہ لکھتے ہیں۔

لکھنؤ کے شعرا اور عوام الناس نے بعض الفاظ اور محاورات کو خاص خاص محل پر استعمال کرنا شروع کیا اور ان کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ محل استعمال دہلی کے طریقہ استعمال سے بہتر اور موزوں تر ہے[1]

اس دعوے میں اہل لکھنؤ کے حق بجانب ہونے کی تصدیق دہلی کے مشہور اہل قلم یعنی حضرت آزاد یوں کرتے ہیں :۔

جب ان کے (اہل لکھنؤ) اور دہلی کے محاورے میں اختلاف ہو گا تو اپنے محاورے کی فصاحت پر دلائل قائم کریں گے بلکہ انھیں کے بعض نکتوں کو دہلی کے اہل انصاف بھی تسلیم کریں گے[2]

مولانا حکیم عبدالحئی مرحوم بھی حضرت آزاد کی تائید کرتے ہیں

زبان کی تراش خراش کر کے بھدے اور ناگوار الفاظ جو ان کے زمانہ میں مروج تھے ترک کر دیئے ۔۔۔ آئے ہے "جائے ہے" وغیرہ ان سب کو خلاف فصاحت قرار دیا جس کو بالآخر دلی والوں کو بھی ماننا پڑا

---

[1] ترجمہ تاریخ ادب اردو ص ۲۶۳ [2] آب حیات ص ۳ [3] گل رعنا

انھیں باتوں کا نام زبان کی اصلاح اور ترقی ہے۔ اور یہ کام مخصوص اہل لکھنؤ کا ہے جو کسی دوسرے شہر کے باشندوں کے بس کی چیز نہیں ہے۔

زبان میں لہجہ کی اہمیت

ان باتوں کے ساتھ ایک چیز لہجہ بھی ہے جس کو اہل زبان کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ میر انشاء اللہ خاں انشاء کہتے ہیں :—

از اردو تنہا الفاظ اردو مقصود نیست لہجہ ہم در و شریک است
کہ اگر اصالت اردو باشد دریں صورت ہر کہ لفظ و لہجہ ہر دو درست
داشتہ باشد استاد کامل است [1]

لفظوں کی اصلی ساخت کی بقا لہجہ پر منحصر ہے۔ نقش تحریر میں تاب گویائی کہاں سے لاؤں جو بتلائے کہ لہجے سے تلفظ کس طرح بدل جاتا ہے گر ہے سخت بسر رشتہ مضمون زدہ است۔ کوشش کرتا ہوں کہ کسی طرح مطلب ادا کر سکوں۔ مثلاً "کیوں" بمعنی "چرا" اہل لکھنؤ کے لہجے میں کچھ اور تلفظ رکھتا ہے اور دوسری جگہ کے لوگ دوسری طرح سے اس کا تلفظ کرتے ہیں۔ جس فرق کو تحریر کے ذریعہ سے نہیں بتایا جا سکتا اسی طرح بعض جگہ کے لوگ "کہو" کو "کھو" "گرو" کو "گرُو" "آنکھیں" کو "آنکھس" باتیں کو "باتیں" کہتے ہیں۔ اکثر مقامات کے لوگ کاف بیانیہ (کہ) کو "کی" کہتے ہیں۔ "پیسا" میں "سا" کا تلفظ تو ہر جگہ ایک سا ہے مگر "پے" کے تلفظ میں اختلاف ہے۔ اہل لکھنؤ پے بروزن شے (چیز) کہتے ہیں

[1] دریائے لطافت ص ۳

اکثر مقامات کے لوگ پئی بروزن حیٌ (زندہ) اور بعض جگہ کے لوگ پے بروزن ہے (حرف رابط) بولتے ہیں۔ ایسی بیشمار لفظیں ہیں جن کے استعمال میں اہل لکھنؤ امتیازی شان رکھتے ہیں ؎

ہوتا ہے خاص لہجہ کرتے بھی ہیں جو باتیں
عزیزی سخن کا سکہ بٹھانے والے (عزیز)

لفظوں کی حرکت کا فرق

لہجہ کی طرح اکثر جگہ کے لوگ اہل لکھنؤ کے تلفظ کے خلاف لفظوں کی حرکت بدل دیتے ہیں۔ "آٹے" کو "آٹا" سہارنپور اور اس کے اطراف میں خاص و عام سب کی زبان پر ہے۔ آگرہ اور اس کے نواح میں ضمیر متکلم "میں" کو بکسر میم اور یائے (بمعنی) بہ کو بکسر ہائے فارسی پنجاب میں دَفتر کو دُفتر۔ خبر کو خبر کہتے ہیں یہ ایسے فرق جو مختلف جگہ کی زبانوں میں پیدا ہو گئے ہیں اسی کو زبان کی موچ کہتے ہیں۔
انشاء اللہ خاں انشاء لکھتے ہیں :—

ساکنان بلاد دیگر ہر چند بعضے روزمرہ خود را در صحبت
اہل دہلی رسانیدہ اند لیکن از لہجہ مجبور اند۔ ہمیں کہ حرفی زنند
شناختہ می شوند [1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :—

و باشندۂ دیگر اگر عمر خود را در تصحیح اردو بگذارد گزیرش ناممکن است [2]

ایک اور مقام پر یہی مطلب یوں ادا کرتے ہیں۔

"کلام باشندہ ہر شہر ولادت کند بر مولد و موطن" [3]

[1] دریائے لطافت ص ۳ (۲) دریائے لطافت ص ۳۶
[3] دریائے لطافت ص ۲

مرزا محمد ہادی مرزا تحریر فرماتے ہیں

واقعی روزمرہ تو کسی قدر آ بھی جاتا ہے مگر لہجہ نہیں آتا [1]

مولانا صفی نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے :-

چال کو انیس کی زنہار چل سکتا نہیں
جس کی جو فطرت ہے وہ اسکو بدل سکتا نہیں

انھیں وجہوں سے دوسرے شہر کے ادیب ، شاعر اور عالم جنھیں خدا نے صائب رائے اور سلیم ذوق عطا کیا ہے - اپنے کو مقلد اور متبع سمجھنے پر مجبور پاتے ہیں - صوبۂ بہار کے مشہور ذی علم رئیس متعدد علموں اور فنوں کی کتابوں کے مصنف اور مختلف زبانوں کے ادب و شعر کے ماہر شمس العلماء نواب امداد امام اثر کی رائے ملاحظہ ہو :-

ہر چند یہ زبان ہندوستان کے اکثر حصوں میں بولی جاتی ہے مگر اس کے صحیح بولے جانے کی نسبت صرف دہلی اور لکھنؤ کی طرف کی جاتی ہے — ان دونوں شہروں کے علاوہ اور جگہوں کے اردو بولنے والے اہل زبان کہے جانے کا حق نہیں رکھتے مثلاً ساکنین صوبہ بہار کے ہر چند اردو ہی بولتے اور لکھتے ہیں مگر ان کی زبان کو کسی طرح سند نہیں مانتے حقیقت حال بھی یہی ہے کہ ہم بہاریوں کی زبان اہل لکھنؤ یا اہل دہلی کو پسند نہیں ہو سکتی ہم لوگوں کا بڑا کمال یہی ہے کہ زبان داں کہلائیں

[1] امراؤ جان ادا صفحہ ۱۵۶

اہل زبان ہوتا تو تمام تر خارج از امکان ہے ..... بہرحال جاننا چاہیے کہ لکھنؤ اور دہلی میں سندی اردو بولی جاتی ہے [2]

ایک دوسری جگہ اپنا خیال یوں ظاہر کرتے ہیں :-

ہندوستان کے ان حصوں میں جہاں اردو بولی جاتی ہے مستند غزل گوئی صرف دو جگہوں کی سمجھی جاتی ہے یعنی دہلی اور لکھنؤ

زبان کے اعتبار سے تو یہ خیال بالکل صحیح ہے کس واسطے کہ ان دونوں جگہوں کے برابر کہیں کی زبان نہیں سمجھی جا سکتی [3]

جو لوگ زبان کے ان نکتوں سے بے خبر ہیں وہ مرکزیت کے منکر ہیں

زبان کی مرکزیت کا دوسرا پہلو

اس مسئلہ کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ علمائے ادب کے نزدیک کلام میں فصاحت روزمرہ اور محاورے کی پابندی سے پیدا ہوتی ہے — مولانا حالی کی رائے

[3] زبان کے مرکز کے باشندے اہل زبان اور دوسرے شہر کے رہنے والے جو اہل زبان کی بول چال سے خوب واقفیت حاصل کر لیتے ہیں - زبان داں کہلاتے ہیں یہ دونوں اصطلاحی نام ان معنوں کے لیے مقرر ہو چکے ہیں اور برابر استعمال ہوتے چلے آ رہے ہیں لیکن جناب یاس ویگانہ نے "چراغ سخن" میں اس پر بڑی بحث کی ہے کہ ہر اردو بولنے والے کو اہل زبان اور منطق زبان کو زبان داں کہنا چاہیے - علم و ادب کی دنیا میں اصطلاحی معنوں میں ایسی فرمائش پہلی مرتبہ ہے - سمجھ میں نہیں آتا کہ مصطلح معنوں میں تغیر پر کیوں اصرار ہے وضع اصطلاح کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے - وہ جدید اصطلاح وضع کر سکتے ہیں پرانی اصطلاحیں جو اپنا مفہوم ایک مدت سے ادا کرتی چلی آ رہی ہیں وہ کیوں کر دوسرے معنی اختیار کر سکتی ہیں لامشاحۃ فی الاصطلاح [4] کاشف الحقائق صفحہ ۸۹

ملاحظہ ہو۔

کلام میں جس قدر روزمرہ کی پابندی کم ہوگی۔ اسی قدر وہ درجہ
فصاحت سے ساقط سمجھا جائے گا ___

الغرض نظم ہو یا نثر دونوں میں روزمرہ کی پابندی جہاں تک ممکن ہو
نہایت ضروری ہے [2]

سید نظیر الحسن صاحب فوق مصنف المیزان کی رائے بھی یہی ہے

روزمرہ کی پابندی تمام اقسام کلام مثل تحریر و تقریر نظم و
نثر میں نہایت ضروری ہے۔ جس قدر کلام میں روزمرہ کا لحاظ زیادہ
کیا جائے گا اسی قدر فصاحت کے معیار پر پورا اترے گا۔ اور مقبول
طبائع خاص و عام ہوگا۔ بغیر محاورے کے کوئی کلام فصاحت و
بلاغت کے اعلیٰ معیار پر نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن اگر روزمرہ کی پابندی
نہ ہوگی تو درجہ فصاحت سے گر جائے گا [1]

اب دیکھنا ہے کہ روزمرہ کے کیا معنی ہیں اگر وہ لفظیں اور ترکیبیں
جو عام طور پر سب کی زبان پر آتی رہتی ہیں روزمرہ ہیں تو آپ فرمائیے
ہم نے جانا ہے۔ میرے کو کھانا ہے۔ آپ کو کیا ہونا ہے۔ ہم بار بار سنا کرتے ہیں
اور ان کے روزمرہ ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیا انھیں کی پابندی
فصاحت کی ضامن ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ ہر باحواس اس کے جواب میں فوراً
نہیں کہے گا۔ پھر کیا ملک کے ادیبوں اور شاعروں کو زبان کا مالک اور
ان کے روزمرہ کو مستند سمجھا جائے۔ اس صورت میں ہر ادیب کا ذوق

[1] المیزان ص ۷۱

اس کی اصلاحات۔ تصرفات متروکات اور گرد و پیش کے محاورات اسکی
زبان کو ایک مخصوص زبان بنا دیں گے جو دوسری جگہ کے رہنے والے کو اپنی
زبان کے فصیح و مستند ہونے پر اصرار کرنے سے نہ روک سکے گا۔ اور جتنے
علاقے اتنی زبانیں بن جائیں گی۔ اس طرح نہ کوئی قاعدہ بن سکے گا نہ اس کا حاصل
کرنا ممکن ہوگا نہ ملک کی کوئی عام زبان بن سکے گی۔ یہ حالت تو مقامی بولیوں
کی ہوتی ہے۔ کسی زبان کے لئے تو یہ ممکن نہیں کہ اس کے صحیح و غلط سمجھنے کا
کوئی معیار نہ ہو۔ اگر اس معیار کا ہونا ضروری ہے تو کسی خاص زبان کو معیاری
ماننا پڑے گا ورنہ ہر ادیب اپنی جگہ پر صاحب زبان ہوگا اور اس کے حلقہ اثر
کی ایک مخصوص زبان ہوگی، جس کا سمجھنا دوسروں کے لئے ممکن نہ ہوگا۔
مثال کے طور پر جناب سیماب اکبر آبادی کو لے لیجئے۔ آپ کسی زبان کی پابندی
اپنے لئے ضروری نہیں سمجھتے۔ بلکہ آگرہ کو خود زبان و شاعری کا مرکز مانتے
ہیں حالانکہ عملاً ایسا نہیں کیونکہ نظم و نثر جس زبان میں وہ لکھتے ہیں وہ لکھنؤ
کی درست کی ہوئی ہے۔ البتہ خود مجتہد زبان یا ناواقف زبان ہونے کی وجہ
سے غلط محاورے اور ترکیبیں استعمال کر جاتے ہیں اسی کو آگرویت سمجھ
لیجئے۔ موصوف نے ایک نظم کہی ہے جس کا موضوع یہ ہے کہ ہندوستان

سروں پر رات دن لٹکی ہوئی ہیں تیز تلواریں — خمیدہ سر بھگتنے کو مآل کار بیٹھے ہیں

سروں پر تلواریں لٹکنا محاورہ نہیں تلوار کھینچنا محاورہ ہے۔ لٹکنے
میں مارنے کا ارادہ شامل نہیں۔ ہزار تلواریں اگر لٹک رہی ہوں تو کوئی خطرہ
کی بات نہیں لیکن ایک تلوار بھی کھنچی تو جان کا خطرہ ہے بھگتنا برے
عمل کے نتیجے کو کہتے ہیں اور یہ مطلب شاعر کا نہیں اس لئے بھگتنے کو مآل کار بیٹھے ہیں

غلط اور منشائے بلاغت کے خلاف ہے

مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو جو اردو دانی اور اردو نوازی میں بڑی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ مقدمہ باغ و بہار میں لکھتے ہیں عام پڑھے لکھے لوگ بھی شاعری کو زبان کو زبان مانتے ہیں۔

لغت نویسوں نے بھی اکثر انہیں کی پیروی کی اور دیوانوں کو ٹٹول کر الفاظ اور محاورے جمع کر دیئے بہت سے لفظ یوں ہی پڑے رہ گئے اور کسی نے خیال بھی نہ کیا۔ اب ضرورت ہے کہ ایسے لفظوں کو جو آڑے وقت پر کام آنے والے ہیں اور جن کے مفہوم کو دوسرے لفظ اس خوبی سے ادا نہیں کر سکتے گمنامی سے نکال کر کام میں لایا جائے

اس عبارت میں دیوانوں کو ٹٹولنا محاورے کا بے محل صرف ہے بصارت نہ ہونے یا بصارت سے کام نہ لے کہ کسی چیز کو ڈھونڈھنا، ٹٹولنا کہا جاتا ہے۔ اندھا راستہ ٹٹولتا ہے اندھیرے میں چیز ٹٹولی جاتی ہے، ٹٹولنے اور ڈھونڈھنے میں بھی فرق ہے کہ ڈھونڈھنے والا آنکھ سے دیکھ کے عقل سے سمجھ کے کام کرتا ہے اور ٹٹولنے والا اندازے سے۔ دیوانوں سے لفظوں اور محاوروں کو جمع کرنا اندازے سے نہیں ہوتا بلکہ اس میں بصارت و بصیرت دونوں سے کام لینا پڑتا ہے جس کو ٹٹولنے سے تعبیر کرنا منشائے بلاغت کے خلاف اور محاورے کا غلط استعمال ہے پھر لطف یہ کہ ٹٹولا دیوانوں کو ملیں لفظیں۔ "ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ" اس سے بھی زیادہ پُر لطف یہ عبارت ہے۔

"اب ضرورت ہے کہ ایسے لفظوں کو جو آڑے وقت پر

کام آنے والے ہیں اور جن کے مفہوم کو دوسرے لفظ اس خوبی سے ادا نہیں کر سکتے گمنامی سے نکال کر کام میں لایا جائے"

آڑے وقت پر کام آنا ایک محاورہ ہے جس کے معنی ہیں آنے والی مصیبت کو روک لینا۔ دوسری لفظوں میں یوں کہیے کہ مصیبت میں سپر بن جانا مثلاً کوئی مصیبت آنے والی ہو اور رک جائے تو کہتے ہیں۔ کبھی کی نیکی تمہارے آڑے وقت پر کام آگئی یا کسی کی وجہ سے کوئی بلا ٹل جائے تو کہتے ہیں کہ فلاں تمہارے آڑے وقت پر کام آگیا۔ اس محل پر آڑے وقت پہ کام آنا ایک مہمل بات ہے اور صرف محاورہ استعمال کرنے کے طول یا اردو دانی کی نمائش نے قلعی کھولی ہے یہ تو تھے محاورے اب لغت دانی کا حال ملاحظہ فرمایئے۔ اسی کتاب کے آخر میں ایک فرہنگ ہے جس سے اردو دانی میں بہت کچھ اضافہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً۔

اوقچہ :- اس کے معنی لکھے ہیں پلنگ پوش یا بالا پوش۔ اوقچہ ایک چیز ہے جو عرض میں تخت، پلنگ یا مسہری کے پایوں کے برابر ہوتی ہے اور طول میں چاروں پایوں کو گھیر لیتی ہے۔ پلنگ پوش اسکے علاوہ ہے۔

بجھرا۔ کوزہ۔ آبخورہ۔

اس کا املا بھی غلط ہے بجائے ہائے مخلوط کے، ہائے ہوز (بجہرا) ہونا چاہیے اور معنی بھی غلط ہیں یہ نہ آبخورہ، نہ کوزہ بلکہ گھڑے کا ڈھکنا ہے جس میں اوپر ڈنڈی لگی ہوتی ہے۔ شکل یہ ہے

خورد خام کرنا۔ ٹکڑے کرنا۔ چورا کرنا۔ اس کے معنی ہیں زد و کوب کرنا۔ مارنا۔ پیٹنا۔ یہ مشتے نمونہ ہے۔

ع خوف طول کیا قصہ مختصر ہم نے
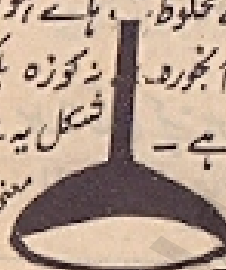
یہ ملک کے دو مشہور ادیب ہیں۔ اول الذکر نظم و نثر دونوں میں مہارت رکھتے ہیں اور زبان و شاعری میں خود ایک اسکول کے بانی یا مجدد ہونے کے مدعی ہیں۔ دوسرے بزرگ کی اردو دانی اتنی مسلّم ہے کہ بابائے اردو کہے جاتے ہیں ان حضرات کی زبان دانی آپ نے ملاحظہ فرمائی۔

یہ اور ان کے ایسے تمام اردو کے آباؤ اجداد کو اگر ہم مستند مان لیں تو پرانی فرہنگوں کو خیرباد کہنا پڑے گا ہر ایک کے محاوروں کی الگ الگ فرہنگ اور زبان کے لئے صرف و نحو کے نئے قاعدے مرتب کرنا پڑیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زبان پر عبور حاصل کرنا ناممکن ہو جائے گا اس لئے ضروری ہے کہ ایک مخصوص طبقہ کی زبان اختیار کی جائے۔ اور سب مل کے اس کی پیروی کریں۔ اس طرح زبان کا حاصل کرنا آسان اور اس کا دائرہ وسیع ہوگا۔ یہیں سے مرکز کی ضرورت ثابت ہوگئی۔ یعنی یہیں کچھ لوگوں کے تلفظ اور محاورے کو معیاری ماننا پڑا۔ وہ کون لوگ ہیں اس کا پتہ لگالینا آسان ہے۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں:۔

جو الفاظ اور جو خاص ترکیبیں اہل زبان کی بول چال میں زیادہ مستعمل اور متداول۔ ان کو روزمرہ کہتے ہیں [1]

([1] موازنہ انیس و دبیر ص۳۶)

مولانا حالی کہتے ہیں:۔

اصطلاح میں خاص اہل زبان کی بول چال کا نام محاورہ ہے [1]

[1] مقدمہ دیوان حالی ص۱۰

اہل زبان کون ہیں اس کا فیصلہ بھی مولانا حالی پانی پتی کی زبانی سنیئے:۔

ہندوستان میں جیسا کہ عموماً تسلیم کیا جاتا ہے صرف دو شہر ہیں جہاں کی اردو معتبر سمجھی جاتی ہے۔ دلی اور لکھنؤ دلی کی زبان اس لئے ٹکسالی سمجھی جاتی ہے کہ اردو کا حدوث اور نشو و نما اسی خطہ میں ہوا ہے۔ لکھنؤ کی زبان کو اس لئے مستند مانا جاتا ہے کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کی ابتدا سے شرفائے دہلی کے بے شمار خاندان ایک مدت دراز تک لکھنؤ میں جا جا کر آباد ہوتے رہے اور ہمیشہ کے لئے وہیں رہ پڑے پس ہندوستان کے کسی شہر کو اہل دہلی سے اس قدر میل جول کا موقع نہیں ملا جس قدر لکھنؤ کو ملا ہے۔ یہاں تک کہ دونوں شہروں کی زبان میں ایک مماثلت پیدا ہوگئی ہے اور خاص الفاظ و محاورات کے سوا دونوں کی بول چال اور لب و لہجہ میں کوئی معتد بہ فرق نہیں معلوم ہوتا [1]

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

جفا کے مونث ہونے میں اہل دہلی و لکھنؤ کو باہم اتفاق ہے کبھی کوئی نہ کہے گا کہ جفا گیا۔ ہاں بنگالہ میں جہاں بولتے ہیں رتی آیا۔ اگر جفا کو مذکر کہیں تو کہیں۔ [2]

[1] دیوان حالی ص۱۱ [2] ادبی خطوط غالب ص۱۱۱

اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر جگہ کی زبان میں مقامی لفظیں محاورے اور ترکیبیں موجود ہیں اس لئے وہ ٹکسالی اور مستند نہیں۔ یہ شرف صرف دہلی اور لکھنؤ کو حاصل ہے اور انھیں دونوں شہروں کی تقلید پر زبان کی درستی منحصر ہے۔ مولانا حالی نے اپنے دیوان کے مشہور مقدمہ میں ایک مستقل عنوان قائم کرکے اس کی اہمیت پر بحث کی ہے وہ کہتے ہیں :۔

زبان کو درستی کے ساتھ استعمال کرنا

اس باب میں سب سے زیادہ مفید اہل زبان کی صحبت اور ان کی سوسائٹی میں اتنی مدت تک بسر کرنا ہے کہ ان کے الفاظ و محاورات بقدر معتدبہ نامعلوم طور پر زبان پر چڑھ جائیں لیکن چونکہ ایسا موقعہ ملنا ہر شخص کو دشوار ہے اس لئے ضروری ہے کہ شعرائے اہل زبان کا کلام جس قدر زیادہ ممکن ہو غور اور توجہ سے بار بار پڑھا جائے نہ اس ارادے سے کہ خیالات اور مضامین میں ان کی تقلید کی جائے بلکہ اس نظر سے کہ وہ الفاظ و محاورات کو کس طرح استعمال کرتے ہیں اور خیالات کو کن اسلوبوں اور کن پیرایوں میں ادا کرتے ہیں سلہ

مولانا حالی کے اس بیان سے اس خیال کی ناپائیداری بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ محاورہ اور روزمرہ کے عام ہو جانے کے بعد تقلید کی ضرورت نہیں - اول تو ان محاوروں کا استعمال ہی تقلید ہے - دوسرے بیان کا ڈھنگ اور ادا کے سیکڑوں اسلوب اور ان میں روزانہ تبدیلی اہل زبان کی تقلید سے کبھی بے نیاز نہیں کر سکتی

سلہ مقدمہ دیوان حالی ص۱۱

زبان کے لئے مرکز کی ضرورت پھر ایک اور دلیل

اس بحث میں یہ نکتہ نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں ہے کہ دہلی اور اس کے اطراف میں جو بولی مروج تھی - اس میں شہری طبیعتوں کی نفاست اور لطافت کے ہاتھوں سے غیر محسوس طریقہ پر تصرفات ہوتے ہوتے لفظیں اصل سے ہٹ گئیں محاورے متغیر ہو گئے - اسلوب بدل گیا۔ دوسری زبانوں کی لفظیں اور ترکیبیں کثرت سے داخل ہو گئیں۔ یہاں تک کہ بات کرنے کا ڈھنگ بھی بدل گیا۔ اس خلط کے اثر سے کچھ نئی لفظیں اور محاورے بھی پیدا ہو گئے مثلاً "الم غلم" "الم تلم" "اڑ تھانس" "آپا دھاپی" "دھینگا مشتی" "الا غوجی" "اناپ سناپ" "آئیں بائیں شائیں" وغیرہ اس طرح گویا ایک نئی زبان بن گئی۔ یہی اردو ہے - گزشتہ صفحوں میں حالی کا یہ قول آپ کی نظر سے گزر چکا ہے کہ :۔

> دہلی کی زبان اس لئے ٹکسالی زبان سمجھی جاتی ہے کہ اردو کا حدوث اور نشو و نما اسی خطہ میں ہوا ہے -

اردو زبان کا سب سے پہلا مورخ انشاء اللہ خاں بھی اردو کا مولد شاہجہاں آباد بتاتا ہے

> چوں بیشتر جائے عیش سلاطین تیموریہ دارالخلافہ شاہجہاں آباد بودہ است ـــــــــ خوش بیانان آنجا متفق شدہ از زبانہائے متعدد الفاظ دلچسپ جدا نمودہ بعضے عبارات و الفاظ تصرف بکار بردہ زبانے تازہ سوائے زبان ہائے دیگر بہم رسانیدند بہ اردو موسوم ساختند سلہ

سلہ دریائے لطافت ص۱تا۲

میرامن کی تصریح کے مطابق اُردو کی بُنیاد اگرچہ آگرہ میں پڑی
مگر زبان کی حیثیت اس کو دہلی میں حاصل ہوئی ۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں :

جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے
ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان
لاثانی کی سُنکر حضور میں آکر جمع ہوئیں لیکن ہر ایک کی گویائی
اور بولی جدا جدا تھی ۔ اکٹھے ہونے پر آپس میں لین دین سودا سلف
سوال جواب کرتے کرتے ایک زبان اُردو کی مقرر ہوئی جب
حضرت شاہجہاں صاحبقران نے ______ شہر کو اپنا
دارالخلافہ بنایا ۔ جب سے شاہجہاں آباد مشہور ہوا ______
زبان اُردو کی منجتے منجتے ایسی منجی کہ کسی شہر کی بولی اس سے ٹکّر
نہیں کھاتی ۔ [۱]

عبدالغفور نسّاخ رسالہ تحقیق زبان ریختہ میں لکھتے ہیں :۔

زبان اُردو روزمرّہ شہر دہلی کو کہتے ہیں [۲]

دیہاتوں میں زبان اپنی اصل پر بہت حد تک باقی رہ گئی ۔
دوسرے شہروں کے باشندوں نے بھی دہلی کی شہری زبان کو ٹکسالی
سمجھ کے تقلید کی اس سے ہر شہر کی زبان اپنے دیہاتوں کی زبان
سے ممتاز ہوگئی ۔ پھر بھی مقامی لفظیں اور محاورے بہت کچھ باقی
رہ گئے ۔ اس وجہ سے زبان کھچڑی ہوگئی اس کے معنی یہ ہوئے کہ
دہلی اور لکھنؤ کی زبان مستند ہے ۔ دوسرے شہروں کے باشندوں

[۱] باغ و بہار [۲] رسالہ تحقیق زبان ریختہ

نے وہیں کی زبان کا چربا اُتارا ۔ اس پر بھی خالص نہ بن سکی ۔ اب
اگر کسی لفظ کے صحیح و غلط محاورے کے معنی اور محل استعمال پر بحث
ہوگی تو انھیں کے کلام سے فیصلہ کیا جائے گا جن کی وہ زبان ہے ۔
انہیں وجہوں سے تمام اہل فن نے متفقہ طور پر دہلی اور لکھنؤ کو
زبان کا مرکز تسلیم کر لیا ہے ۔

پروفیسر مسعود حسن صاحب ادیب تحریر فرماتے ہیں :۔

دہلی اور لکھنؤ اپنی خصوصیتوں کے اعتبار سے زبان
کے مرکز قرار پا چکے ہیں [۱]

اور بقول حضرت صفی ۔

شہر دو ہیں صاف ستھری ہے جہاں کی گفتگو
نقل اوّل خاص دہلی نقش ثانی لکھنؤ

[۱] حاشیہ نظام اُردو ص

دوسرا باب

دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں کس کو ترجیح ہے

مستند ہے اور معیاری زبان لکھنؤ
رشک ہر کام وو دہاں کام وو دہان لکھنؤ

گزشتہ باب میں ہماری بحث کا صرف یہی ایک پہلو تھا کہ ہر زبان کو ایک مرکز کی ضرورت ہے۔ اور اردو کے دو مرکز ہیں۔ ایک دہلی اور دوسرا لکھنؤ۔ لیکن اس باب میں ہم بتائیں گے کہ دہلی اور لکھنؤ میں کس مرکز کو اہمیت ہے۔

یہ اصول آپ کے سامنے پیش کیا جا چکا ہے کہ زبان کا مرکز ہونا صرف اس امر سے متعلق ہے کہ کسی جگہ اصلاح زبان کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ جب تک دہلی کو یہ اہلیت حاصل تھی اس وقت تک اس کو مرکزیت کا فخر تھا اور جب یہ خصوصیت اس کی باقی نہ رہی تو مرکزیت کے شرف سے محروم ہو گئی اور لکھنؤ کو انھیں خصوصیتوں کی وجہ سے مرکزیت کا درجہ مل گیا۔ اردو کے مشہور مصنف مولانا عبدالحلیم شرر کا خیال ہے کہ

> دہلی میں اگلے دنوں یہ اخلاقی اصول یقیناً سب جگہ سے بڑھے ہوئے ہوں گے۔ اس لئے کہ وہاں کا دربار سب سے بڑا تھا اور صدیوں سے قائم چلا آتا تھا۔ مگر

> تجارت پیشہ اقوام کے سوسائٹی پر غالب آجانے کی وجہ اگلی ساری تہذیب خاک میں مل گئی جہاں تجارت کو فروغ ہوگا اور تاجروں کی معاشرت خوش باش امیروں اور شہزادوں پر غالب آجائے گی وہاں اخلاقی قانون باقی نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ اسی چیز نے دہلی کے اگلے عظیم الشان دربار کی ساری آن بان مٹا کے رکھ دی اور وہ بات نہیں رہی جو اس کی ناموری کی تاریخ کے شایان شان تھی۔ دہلی کی تہذیب کو جب تاجروں کا ہجوم تباہ کرنے لگا تو اس نے اپنے قدیم وطن سے بھاگ کر لکھنؤ کے چھوٹے سے دربار میں پناہ لی جو اگرچہ چھوٹا تھا مگر اس کی سواد میں داخل ہونے کے بعد کسی کو نظر نہ آسکتا تھا کہ دنیا میں یہاں سے بڑا کوئی دربار بھی ہے۔ پھر آزادی ملے [illegible] شرفائے دہلی نے اپنے قوانین نشست و برخواست کو یہاں ظاہر کیا تو چند ہی روز میں یہ حالت ہو گئی کہ اکیلا لکھنؤ ہی سارے ہندوستان میں تہذیب و شائستگی آداب نشست و برخواست کا مرکز بنا اور تمام شہروں کے مہذب اہل لکھنؤ ہی کی پیروی اور تقلید کرتے تھے[1]

دہلی کے مشہور شاعر انشاء اللہ خاں کا مشاہدہ یہ ہے:

لکھنؤ بر شہر ہائے دیگر شرفے و مرجع و جان شاہجہاں

[1] گزشتہ لکھنؤ

آباد است زیراکہ فصحا و سلیقہ شعار کر جان آں شہر باشند
دریں شہر مجتمع اند پس شاہجہاں آباد حکم قالب بے جان دارد
و لکھنؤ جان او ست [2]

مرزا اسد اللہ خاں غالب کے رشید شاگرد میر مہدی مجروح نے
اپنی ایک غزل میں دہلی کی زبان پر یوں ناز کیا تھا:۔

"میاں یہ اہل دہلی کی زبان ہے"

یہ غزل جب اصلاح کے لئے غالب کے پاس پہنچی تو انھوں نے
بے جا تفاخر مجروح کو یہ فہمائش کی:۔

اے میر مہدی تجھے یہ کہتے شرم نہیں آتی
"میاں یہ اہل دہلی کی زبان ہے"
اہل دہلی یا ہندو ہیں اہل حرفہ۔ یا خاکی یا پنجابی یا گورے ہیں
ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے۔
"لکھنؤ کی زبان میں فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی باقی
ہر فن کے کامل لوگ موجود ہیں"۔

اس کے جواب میں مجروح نے جو کچھ لکھا ہے وہ از سرتا پا مجروح
ہے۔ پہلے غالب کا خط پھر مجروح کا جواب سنیئے

غالب کا خط مجروح کے نام

جان غالب تمہارا خط پہنچا۔ غزل اصلاح کے بعد پہنچتی ہے

---

[2] دریائے لطافت

اے میر مہدی تجھے یہ کہتے شرم نہیں آتی
"میاں یہ اہل دہلی کی زبان ہے"
اہل دہلی یا ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں
ان میں سے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے۔ لکھنؤ کی آبادی
میں فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی۔ باقی ہر فن کے کامل لوگ
موجود ہیں۔ [illegible] کی ٹٹی بردا ہوا۔ اب کہاں وہ لطف تو اسی
مکان میں تھا۔ اب میر خیراتی کی حویلی میں وہ جہت اور سمت بدلی ہوئی ہے
[illegible] حال ہی گذرا۔

مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی
کے کنوئیں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے
گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت
کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ دروازے
تک بے مبالغہ ایک صحرائے لق و دق ہے۔ اینٹوں کے
ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ایک ہو کا مکان ہو
جائے۔ یاد کرو مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کوئی بانس
نشیب تھا اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا۔ یہاں تک کہ
راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے
رہے ہیں باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازہ کا حال تم دیکھ
گئے ہو۔ اب کلکتہ دروازے ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ۔ دھوبی
واڑہ، رام جی داس گنج۔ سعادت خاں کا کٹرہ۔ جرنیل کی
بی بی کی حویلی۔ رام جی داس گودام والے کے مکانات صاحب رام

کالاغ حویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا۔
اب جو کنوئیں جاتے رہے پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا
ہو جائے گا۔ اللہ اللہ دہلی نہ رہی اور دہلی والے اب تک
یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں، واہ رے حسن اعتقاد۔
ارے بندۂ خدا! اردو بازار نہ رہا، اردو کہاں؟ دلی واللہ
اب شہر نہیں۔ کیمپ ہے، چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر نہ
بازار نہ نہر رہے نام اللہ کا ....

غالب

مجروح کا جواب

قبلہ و کعبہ! آداب بجا لاتا ہوں۔ بھلا حضرت مجھے
کیوں شرم آئے اگر شرم آئے تو رجب علی سرور کو آئے جس نے
وہ لاف و گزاف کیا کہ جیسا لکھنؤ ہے ویسا کوئی شہر ہی نہیں۔
ان سے کہا چاہیے کہ ارے بندۂ خدا خدا سے ڈر لکھنؤ کس
بادشاہ کا دار الخلافہ رہا ہے۔ کون سی تاریخ میں وہاں کے
لوگوں کی خوش بیانی کا حال لکھا ہوا ہے، ماسبق تو اس کی
یہی ہے نا کہ مضافات صوبہ اودھ میں کا ایک شہر ہے یہ دلی سے
کیونکر مقابلہ کرے گا کہ اگر پانسو برس کی تصنیفات دیکھو گے
تو اس میں سے یہی لکھا پاؤ گے ؎

حضرت دہلی کنف عدل و داد
جنت عدن است کہ آباد باد

اس پر طرہ یہ کہ یہاں کی زبان ہے وہ کہیں کی نہیں۔ باوجودیکہ
[illegible] ناسخ نے لکھا ہے ؎

سن چکے ہیں خوب اُردوئے معلی کی زباں
سالہا صحبت رہی ہے ہم کو دلی شہر کی

اور یہ بات ظاہر ہے کہ میر دلی کے تھے۔ مگر افسوس کہ ان کے پیرو
اس بات پر خیال نہیں کرتے۔ اے حضرت میں آپ سے یہ پوچھتا
ہوں کہ آپ کو وہاں کی کونسی ایسی بات پسند آگئی کہ ایسی
[illegible] فرمائی۔ قطع نظر زبان سے تراش خراش، لباس
بھی وہاں کی نرالی ہے۔ واہ رے دلی تیرے قربان کیا حد
اوسط پر سب کا عمل تھا کہ سب چیز افراط و تفریط سے مائل
بہ وسط تھی۔ کیوں نہ ہو خیر الامور اوسطہا پر سب کا عمل تھا۔
بھلا حضرت یہ کیا آپ فرماتے ہیں کہ وہاں سب طرح کے
اہل کمال موجود ہیں، بھلا دلی سے زیادہ بھی کہیں اہل کمال
[illegible] ہوں گے۔ میاں امیر کے برابر کونسا خوشنویس تھا۔
حضرت غالب کی سی نظم و نثر کس کی۔ امام الدین خاں صاحب
سا حکیم۔ مولانا صدر الدین خاں سا عالم۔ محمد اعظم سا مصور
بدر الدین خاں سا مہر کن کہاں ہے۔ دستنبو کی طرح نواب
گورنر بہادر نے کس کی تصنیف طلب کی۔ بدر الدین خاں کے
مانند [illegible] کی مہر کھدنے کس مہر کن کے پاس آئی۔ خانم کے
بازار کے وہ کاریگر جنھوں نے انگریزی مال و اسباب
بدل ڈالا اور نہ کسی کو معلوم ہوا۔ یہ لوگ کہاں؟ گو دلی

اب اجڑ گئی۔ اور سارا شہر برباد ہو گیا مگر اس شہر سے جس کی تعریف
میں پہلے ہی میر حسن صاحب مثنوی میں فرما گئے ہیں بہتر ہی ہے ؎

زبس یہ شہر ہے بہتر پہ بستا — کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستہ
کسی کا آسماں پہ گھر ہوا میں — کسی کا جھونپڑا تحت الثریٰ میں

دلی کی شہرت اور خوش قطعی کی تعریف کروں تو ایک کتاب
بن جائے خط سمجھ کر موقوف کیا

مہدی مجروح

غالب نے اپنے خط میں دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا فرق یہ بیان کیا
ہے کہ دہلی میں زبان کے مالک نہیں رہے۔ اب فلاں فلاں طبقے کے لوگ
ہیں جن کی زبان مستند نہیں کہی جا سکتی اور لکھنؤ میں وہ تمام لوگ
موجود ہیں جن کو اہل زبان کہا جاتا ہے۔ اس لئے اس کے مقابلہ میں
دہلی کی زبان کو ترجیح نہ دو۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے نرالے طرز ادا
میں دہلی کی بربادی کی ایک تصویر کھینچی ہے اس طرح اپنے دعوے
کی دلیل بھی پیش کر دی ہے۔ یہ حالت دکھانے کے بعد پھر کہتے ہیں
کہ دہلی نہ رہی اور دہلی والے اب بھی یہاں کی زبان کی تعریف کئے
جاتے ہیں۔ یہ حسنِ اعتقاد نہیں تو اور کیا ہے؟

مجروح کی غلطیاں

اس کے جواب میں مجروح نے اصولی غلطیاں
کی ہیں۔

غالب نے اپنے زمانے کے لکھنؤ کا فرق بیان کیا ہے اور مجروح
پرانے زمانہ کی باتیں دہرا رہے ہیں۔ "سوال از آسمان جواب از ریسماں"
اس سے کس کو انکار ہے کہ دہلی کبھی لکھنؤ سے بہتر تھی۔ سوال تو

[illegible] آج کے لکھنؤ اور دہلی میں کیا فرق ہے؟ اس لئے مجروح کے
[illegible] موضوع سے خارج ہے آگے چل کے وہ لکھتے
ہیں کہ فلاں فلاں اہل زبان اور صاحب کمال آج بھی موجود ہیں
[illegible] اس کتاب میں کہیں بتا چکا ہوں کہ اس زمانے میں کچھ صاحبان کمال
[illegible] اور وہیں رہے جن کا ذکر مجروح نے کیا ہے لیکن وہ
[illegible] معاملہ میں لکھنؤ کے خوشہ چیں تھے۔ اسی سے لکھنؤ اور دہلی کا فرق
[illegible]

[illegible] دور دلی کے سنبھالے کا زمانہ کہا جاتا ہے یعنی جس طرح
[illegible] سنبھل جاتا ہے۔ یوں ہی دہلی نے ایک مدت
[illegible] کی سانس لی اور کچھ اہل کمال پیدا ہوئے پھر سناٹا ہو گیا؟
[illegible] کہ در ایام بہار آمد و رفت
[illegible] سے ہوتا ہی کیا ہے جب کہ سارے شہر میں کدّ بھرا
[illegible] مٹ چکی ہیں۔ یہی غالب دیکھ رہے تھے
[illegible] ایک دوسرے خط میں انھیں مجروح کو لکھا ہے:-

[illegible] پوچھتے ہو کیا لکھوں۔ دلی کی ہستی منحصر کئی
[illegible] ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ چاندنی چوک ہر روز مجمع بازار مسجد جامع کا
[illegible] سیر جمنا کے پل کی۔ ہر سال میلا پھول والوں کا۔ یہ
پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں۔ ہاں کوئی شہر اس قلمرو ہند
میں اس نام کا تھا۔۔۔۔۔۔ تم آتے ہو چلے آؤ۔ جاں نثار
[illegible] کے پھاٹک کی سڑک۔ خان چند کے کوچہ کی سڑک دیکھ جاؤ
[illegible] بیگم کے کوچہ کا ڈھینا۔ جامع مسجد کے گرد ستر ستر گز گول

میدان لکلنا سُن جاؤ غالبؔ افسردہ دل کو دیکھ جائے

اس کے جواب میں مجروحؔ کہتے ہی کیا۔ جب کچھ نہ بن پڑا تو کہنے لگے کہ دلی میں کچھ نہیں ہے نہ سہی آپ تو ہیں۔ وہی مُرغے کی ایک ٹانگ مگر غالبؔ کب کے چُپ ہونے والے تھے آخر کہہ ہی ڈالا۔

سید زادے آزادے دلّی کے عاشق و دلدادے ڈھئے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے حسد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے نہ دل میں مہر و آزرم نہ آنکھ میں حیا و شرم"۔

مولوی عزیز مرزا بھی مجروحؔ کی طرح دہلی سے عقیدت رکھنے والوں میں ہیں اُن کو غالبؔ اس طرح سمجھاتے ہیں:۔

"صاحب کیسی صاحبزادوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ دلی کو ویسا ہی جانتے ہو جیسی آگے تھی۔ قاسم جان کی گلی میر خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ خاں کے پھاٹک تک بے چراغ ہے ہاں آباد ہے تو یہ ہے کہ غلام حسین کی حویلی ہسپتال ہے اور ضیاء الدین خاں کے کمرہ میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اور صاحب عالیشان انگلستان تشریف رکھتے ہیں۔ ضیاء الدین خاں اور ان کے بھائی معہ قبائل اور عشائر لوہارو میں ہیں لال کنوئیں کے محلہ میں خاک اُڑتی ہے۔ آدمی کا نام نہیں۔ تمھارے مکان میں چھوٹی بیگم رہتی تھی۔ وہ لاہور گئی ہوئی ہے۔ کھیمی کی دوکان میں کتے لوٹتے ہیں"۔

ایک دوسرے خط میں انہیں کو یوں لکھتے ہیں:۔

"جو خراب آباد اس زبان کے لیے ٹکسال تھا وہاں بھانت بھانت کا جانور بولتا ہے۔ شہر چھاؤنی سے بدتر ہو گیا امرا کے گھر تباہ ہو گئے۔ گھرانوں کے وارث علم و کمال کے ساتھ رونق [illegible] محروم ہو اس کھو بیٹھے۔

حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ کی اس بحث سے بہت پہلے لکھنؤ علم و فضل [illegible] و شعر، دولت و ثروت میں دہلی کو مات کر چکا تھا۔ مصحفی نے ریاض الشعرا [illegible] اصل وجہ تصنیف یہ لکھی ہے:۔

سبب [illegible] تالیف کثرت موزونان   لکھنؤ کہ بالفعل آبادی شاہجہاں

آباد است [illegible] رشد ۱۲۳

[illegible] خط کا آخری حصہ لکھنؤ کی ہجو میں وہ شعر ہیں جو میر حسن [illegible] تھے۔ اول تو شاعر کی ہجو حقیقت پر مبنی نہیں ہوتی وہ اگر [illegible] ہے تو اپنے دل کا غبار ہجو سے نکالتا ہے اس سے واقعیت [illegible] اور تاریخ کی بنیاد رکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

دوسری اصولی غلطی یہ ہے کہ ہجو میں بھی پرانے زمانے کی بات [illegible] کی جائے میر انیس کے لکھنؤ کے میر حسن کا لکھنؤ پیش کیا ہے (وہ بھی [illegible] کے ساتھ) تین پشتوں کا زمانہ کسی چیز کو بنانے بگاڑنے کے لئے بہت ہوتا ہے۔ میر حسن نے اگر اپنے زمانہ کے لکھنؤ کی وہ ہجو کی ہے تو میر انیس نے اپنے زمانہ کے لکھنؤ کی یہ تعریف کی ہے ؎

ہر دل ہے عندلیب گلستان لکھنؤ
رضواں بھی ہے جناں میں ثناخوان لکھنؤ

خلاصہ اس پر تمام ہوا ہے کہ اگر دہلی کی خوش قطعی اور شہریت کی تعریف

کی جائے تو ایک کتاب بن جائے

دہلی کی خوش قطعی سے کس کو انکار ہے۔ مشکل یہ ہے کہ مجروح
نے غالب کی بات سمجھنے کی قسم کھائی ہے۔ غالب اس دہلی کا ذکر نہیں
کر رہے ہیں جس کے لئے امیر خسرو نے کبھی کہا تھا۔

جنت عدن است کہ آباد باد

وہ تو اس دہلی کو کہہ رہے ہیں جو صحرائے لق و دق ہے۔ میدان
ہے۔ ہو کا مکان ہے جس کے نشیب پٹ گئے۔ باغ کٹ گئے
مکان منہدم۔ مکین منعدم۔ محلے ویران۔ بازار سنسان۔ قصہ مختصر
شہر نہیں رہا صحرا ہو گیا اگر آبادی ہے تو ایسی کہ کالے صاحب کے
مکان میں گورے صاحب رہتے ہیں۔ اگر اب بھی مجروح کی سمجھ
میں نہ آئے تو مجبوری ہے۔

مجروح کی خیانت

یہ مجروح کی اصولی غلطیاں ہیں اور خیانت یہ ہے کہ لکھنؤ کی یہ خرابیاں میر
حسن نے پہلے کی بتائی ہیں۔ بعد کی حالت تو خود انھوں نے انھیں
شعروں کے بعد آصف الدولہ کی تعریف کرکے یہ لکھی ہے جس کو مجروح
جان بوجھ کر چھپا گئے ہے

مٹا دی اس نے یاں کی کدورت
بنا دی لکھنؤ کی ایک صورت

معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن نے لکھنؤ کی جو حالت بیان کی ہے
اس کو اگر صحیح مان لیا جائے تو وہ آصف الدولہ کے قیام سے پہلے کی
ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آصف الدولہ کے قیام نے لکھنؤ

کی حالت بالکل بدل دی اور شہر نئے سرے سے لبا اسی بناء پر
میر حسن نے کہا ہے ع

مٹا دی اس نے سب یاں کی کدورت

میر علی لطف نے گلشن ہند میں لکھا ہے کہ آصف الدولہ ہر روز
ایک تازہ عمارت کی بنیاد رکھتے تھے۔ ارکان سلطنت اور رعایا
کی عمارتوں کا ذکر نہیں۔ گزشتہ لکھنؤ میں آصف الدولہ کے زمانے
میں آباد ہونے والے محلوں کے یہ نام لکھے ہیں:-
امانی گنج۔ فتح گنج۔ رکاب گنج۔ دولت گنج۔ بیگم گنج—
نواب گنج۔ ٹکیت گنج۔ وزیر گنج۔ ترمنی گنج۔ حسن گنج۔ بھوانی گنج۔
[illegible] گنج۔ نواز گنج۔ تحسین گنج۔ علی گنج۔ عنبر گنج۔ محبوب گنج خیالی
گنج۔ خانساماں کا احاطہ۔ ٹکیت رائے کا بازار حسین الدین
خاں کی چھاؤنی۔ کشمیری محلہ۔ صورت سنگھ کا ہاتا۔ نگریا۔ توپ
[illegible] بھاؤ لال کا پل۔

اس زمانہ کی حالت شرر نے یہ لکھی ہے:-

ان دنوں شہر لکھنؤ ایسی رونق پر تھا کہ ہندوستان
ہی نہیں شاید دنیا کا کوئی شہر لکھنؤ کے اوج و عروج
کا مقابلہ کر سکتا ہو گا۔ شجاع الدولہ جو روپیہ فوج اور
جنگی تیاریوں میں صرف کرتے تھے اسے آصف الدولہ نے
اپنی عیش طلبی کے ذوق اور شہر کی آرائش و خوشحالی
میں صرف کرنا شروع کر دیا۔ اور چند ہی روز کے اندر ساری
دنیا کا معلوم و معدوم اپنے یہاں جمع کر لی۔ ان کا حوصلہ

کپتان بیجو یک لکھتا ہے کہ اس کی آبادی پون ملین یعنی ساڑھے
سات لاکھ تھی اور عمارات و شان و شوکت کے اعتبار سے یورپ
کا کوئی دارالسلطنت اس سے بڑھا ہوا نہ تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا
ہے کہ لکھنؤ کے اس چھوٹے سے دربار نے اپنے زمانہ میں
اتنی ترقی کی تھی کہ دولت و ثروت شان و شوکت، تہذیب و تمدن،
علم و ہنر میں ساری دنیا کو گرد کر دیا تھا، اسی لکھنؤ کے لیے انیس نے
کہا تھا ۔

رضواں بھی ہے جناں میں ثنا خوان لکھنؤ

معاف کیجیے گا ۔ ع

لطیف بود حکایت دراز تر گفتم

بحث یہ تھی کہ لکھنؤ کی زبان دہلی سے کیوں بہتر ہے؟ اور اصول
یہ بتایا تھا کہ جہاں علم و ہنر ترقی کرتا ہے وہیں کی زبان بھی معتبر
ہو جاتی ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی کہتے ہیں :۔

دلی جس کو اردوئے معلیٰ کا مسقط الراس اور جنم بھوم
کہا جاتا ہے وہاں ناظم و ناثر پیدا ہونے موقوف ہو گئے ہیں [1]

اس کے مقابلہ میں لکھنؤ کی یہ حالت بیان کرتے ہیں :۔

لکھنؤ کا حال اگرچہ ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ وہاں شاعری
کا چرچا دلی سے زیادہ سننے میں آتا ہے وہاں سے ناول، ڈرامہ
ملک میں برابر شائع ہوتے رہتے ہیں [2]

[1] مقدمہ دیوان حالی ص ۱۱

بس یہی تھا کہ نظام حیدر آباد ہوں یا ٹیپو سلطان کسی کے
دربار کا کروفر اور کسی کی شوکت و حشمت میرے دربار
سے زیادہ نہ ہو سکے [1]

رفتہ رفتہ اس کو اتنی ترقی ہوئی کہ ایک انگریز مصنف
اپنی آنکھوں سے دیکھی ہوئی یہ حالت بیان کرتا ہے :۔

جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ میرے وہم و
خیال سے بھی زیادہ تھا۔ اول اول تو مجھے ایوان شاہی
دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کیونکہ یہ عمارت فی الحقیقت ایک
محل نہ تھا بلکہ گنجینہ محلات و قصور تھا جس کا سلسلہ
دریائے گومتی کے کنارے کنارے (جس پر لکھنؤ آباد ہے)
دور تک چلا گیا ہے۔ محلات اودھ کا بعینہ وہی نقشہ تھا
جیسا کہ محلات شاہی قسطنطنیہ یا ایوان شاہ ایران واقع
طہران یا عمارات شاہی سکین کا سنا جاتا ہے ———

ہیر لشپ صاحب نے ڈریسڈن دوسرے سیاحوں نے
لکھنؤ کو ماسکو سے مشابہ بتلایا ہے ———

ڈریسڈن۔ ماسکو۔ قاہرہ۔ جس سے چاہے آپ لکھنؤ کو مشابہ
قرار دیجیے، مگر میرے نزدیک لکھنؤ کی ایسی عجائب روزگار
چیزیں ان مقامات میں کہیں نظر نہ آئیں گی [2]

[1] گزشتہ لکھنؤ ص ۲۷ [2] مرقع اودھ :۔ لائف آف این ایسٹرن
کنگ۔ ترجمہ منشی احمد علی۔ بی اے ص ۱۲۲

یہ تو بعد کی حالت ہے جب دہلی کو مرکزیت کا درجہ حاصل [illegible]
اس وقت کی حالت دہلی کے رہنے والے اور زبان کی ماہیت
جاننے والے سید انشاء یہ بیان کرتے ہیں :۔

فصاحت در دہلی ہم نصیب ہر کس نیست منحصر است در
اشخاص محدودہ ہرچہ بامتحان راقم رسیدہ است ایں است
کہ ہیچ محلہ خالی از آدم فصیح نیست بعضے جائے دو فصیح و
در بعضے جا سہ و در بعضے جا چہار و ہمچنیں شاید کدام محلہ
خالی از آدم فصیح نیز باشد لیکن بیشتر چنیں است [1]

انشاء اللہ خاں اپنے ذاتی تجربہ سے بتاتے ہیں کہ دہلی میں [illegible]
ہر شخص کو نصیب نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں لکھنؤ کی یہ حالت
بیان کرتے ہیں :۔

دریں شہر ہر محلہ فصیحاں است و انکار ایں معنی از دانائی
بعید است [2]

اس میں شک نہیں کہ خواص عوام کی زبان میں فرق ہوتا ہے
اور خواص ہی کی زبان مستند سمجھی جاتی ہے لیکن زبان کی ترقی اس [illegible]
نام ہے کہ عوام کی زبان بھی فصیح ہو جائے۔ یہ شرف دہلی کو کبھی نصیب
نہیں ہوا اور انشاء کے بیان کے مطابق لکھنؤ کو یہ منزلت اس
وقت حاصل تھی جب اس کی کوئی مستقل حیثیت نہ تھی اور ناسخ [illegible]

[1] دریائے لطافت ص ۲۲ [2] دریائے لطافت ص ۳۶

[illegible] یہ دولت تو یہ دولت عام ہوگئی حضرت غالب بھی اس کی تصدیق
کرتے ہیں :۔

ناسخ نے جن قاعدوں سے زبان کو درست کیا اس کے
سبب سے تمام لکھنؤ کی زبان ایک ہوگئی [1]

مرزا رجب علی بیگ سرور کا قول ہے
جو گفتگو لکھنؤ میں ہے کو بکو ہے [2]

صفیر بلگرامی کا حسب ذیل بیان سرور کے اس قول کی گویا
توضیح ہے :۔

لکھنؤ کے خاص و عام کی زبان یکساں درست ہے
اور بندش فقرات کی جاہل و عام میں یکساں ہے ——
لکھنؤ کے عوام الناس کی زبان شعراء کی ترکیب
و بندش سے ملا کے دیکھ لو [3]

زبان کو فصاحت کے اس درجہ پر پہنچا دینے کی وجہ سے اب صرف	اب صرف لکھنؤ زبان کا مرکز ہے

لکھنؤ زبان کا مرکز ہے۔ صفیر بلگرامی تحریر فرماتے ہیں :۔
جس قدر مدارج زبان کی درستی کے تھے وہ لکھنؤ میں تمام ہوگئے
اب جو طرز نکلے گا لکھنؤ کی درست کی ہوئی زبان سے باہر نہ ہوگا [4]

[1] تذکرہ جلوہ خضر جلد اول ص ۲۳۵
[2] فسانۂ عجائب مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ ص ۱
[3] تذکرہ جلوہ خضر جلد اول ص ۲۳۶ [4] تذکرہ جلوہ خضر جلد اول ص ۲۷

اس کے مقابلہ میں دہلی کی حالت یہ بیان کرتے ہیں :-

وہ صاف شدہ زبان جیسی میر و مرزا نے اختیار کی تھی دہلی میں وہی زبان اب تک مروج معلوم ہوتی ہے اور دلّی کی زبان سے کچھ ایسا فرق نہیں معلوم ہوتا۔ چنانچہ مولوی امام بخش صہبائی دہلوی جو حال میں گزرے ہیں اسکے قائل ہیں اور اپنے رسالہ صرف و نحو اردو میں لکھتے ہیں اور میں بھی اس نمونے کے اشعار (ولی دکھنی کی زبان کے) ذوق و مومن تک کے کلام میں دکھادوں گا پھر زبان کیا صاف ہوئی [1]

یہی شکایت دہلی کی زبان سے غالب مرحوم کو بھی تھی۔ انھوں نے اپنے دیوان کے خاتمہ میں اس کا اظہار اس طرح کیا ہے :-

میرے کلام میں جو الفاظ و محاورے ناقص بندھ گئے ہیں کیا کروں دلّی کی زبان ہی ایسی ہے میں اُن کو ناپسند کرتا ہوں [2]

مولانا علی حیدر نظم طباطبائی تحریر فرماتے ہیں :-

اساتذہ دہلی کے کلام میں آئے ہے جائے اکثر ہے ——

اسی طرح کروں ہوں پھروں ہوں ——

یا تم آؤ ہو جاؤ ہو یا ہم کھائے ہیں پیئے ہیں یہ سب محاورے البتہ غیر فصیح ہیں اور اہل لکھنؤ تو کیا تمام ہندوستان کے کان اس کے سننے کے متحمل نہیں مگر

[1] تذکرہ جلوۂ خضر جلد اول ص ۲۰   [2] خاتمہ دیوان غالب مطبوعہ مطبع احمدی کانپور

[illegible] زبان پر مائل ہیں [1]

دہلی کی یہی زبان جس کو میر و سودا لیکے آئے تھے۔ لکھنؤ والوں [illegible] بلگرامی لکھتے ہیں :-

[illegible] زبان کو دہلی والوں نے درست کیا اور دہلی کی زبان کو لکھنؤ والوں نے درست کیا اور چونکہ ان تینوں مقاموں کا [illegible] یکے بعد دیگرے ہوا اور لکھنؤ کا زمانہ جو سب کے بعد ہوا اس [illegible] اس کی اصلاح قابل پذیرائی ہوگی [2]

[illegible] اللہ خاں دہلوی کہتے ہیں

[illegible] زبان و پوشاک و حرکات محبوبان لکھنؤ بر کلام [illegible] ادا ہائے معشوقان دہلی واضح مبرہن است [illegible] لکھنؤ [illegible] و پوشش و زبان و دیگر چیزہا اند [illegible] یاد گرفتہ اند پس دریں چیزہا مثل آنہا باشند [illegible] از قبیل نزاکت صدا و حسن تکلم و حرکات دلنشین [illegible] ایجاد نمودہ اند زیادہ از معلومات بزرگان [illegible] اینکہ فصیح و بلیغ و لطیف تر از شاہجہاں آباد اند [3]

رام بابو صاحب سکسینہ فرماتے ہیں :-

[illegible] کو یہ شرف حاصل ہے کہ تکمیل زبان کے آخری مدارج

[1] [illegible] دیوان غالب   [2] تذکرہ جلوۂ خضر جلد اول ص ۲۷۲
[3] [illegible] دریائے لطافت ص ۶۷

مدارج انھیں کے مبارک ہاتھوں سے پورے ہوئے [1]

اسی وجہ سے زبان کے رمز شناسوں نے لکھنؤ کو زبان کا مرکز تسلیم کر لیا ہے۔ سید نظیر الحسن صاحب فوق کہتے ہیں:-

لکھنؤ کو حسن شناسان سخن نے زبان کا مرکز تسلیم کر لیا ہے [2]

میر مہدی مجروح کو غالب کی فہمائش آپ سن ایک قول ان کا اور سنیئے:-

میاں! اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو زبان کو زبان کر دکھایا تو لکھنؤ والوں نے اور لکھنؤ میں ناسخ نے ورنہ بولنے کو کون نہیں بولتا۔ مگر میرے نزدیک تو وہ تراش خراش کی گنجائش ہی نہیں چھوڑ گیا۔ ہاں قواعد نہیں لکھ گیا۔ قواعد جاننے والا اس کے کلام کے مزے پاتا ہے۔ ہماری دلی ہمیشہ اس بات میں پیچھے رہی کہ مضمون کے آگے زبان کی درستی نہ کی [3]

دہلی کے مشہور انشاء پرداز شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے اس کا کئی جگہ اعتراف کیا ہے:-

(۱) شیخ صاحب (ناسخ) اور خواجہ حیدر علی آتش کے کمال نے لکھنؤ کو دہلی کی قید پابندی سے آزاد کر کے استقلال کی سند دے دی اور وہی مستند ہوئی اب جو چاہیں سو کہیں ہم نہیں روک سکتے۔

[1] تاریخ ادب اردو ص ۱/۳۱ [2] المیزان ص ۶۲ [3] تذکرہ جلوہ خضر جلد ا

(۲) لکھنؤ والوں کو ٹوکنے کا منہ نہیں کیونکہ جس خاک سے ایسے باکمال اٹھیں۔ وہاں کی زبان خود سند ہے [1]

دہلی والوں نے لکھنؤ والوں کی تقلید کی

صرف اتنا ہی نہیں کہ لکھنؤ کی زبان کو دہلی والوں نے مستند مانا ہو بلکہ اُس کی تقلید کی۔ مولانا علی حیدر نظم طباطبائی لکھتے ہیں:-

(۱) جو لوگ دہلی کے فصحا و نقاد و مالک زبان و قلم میں ان کا کلام لکھنؤ کی زبان سے مطابقت رکھتا ہے"

(۲) ذوق کے کلام میں زبان لکھنؤ کا تتبع پایا جاتا ہے مثلاً فکر بتانیث ذوق نے نظم کیا ہے سانس کو بھی بتانیث باندھا ہے [2]

مولوی محمد حسین آزاد دہلوی فرماتے ہیں:-

اب وہ زمانہ آتا ہے (ناسخ و آتش کا) کہ انھیں (اہل لکھنؤ) کو صاحب زبانی کا دعویٰ ہوگا اور زیبا ہوگا اور جب اُن کے محاورے میں اختلاف ہوگا تو اپنے محاورے کی فصاحت اور دہلی کی عدم فصاحت پر دلائل قائم کریں گے بلکہ انھیں کے بعض نکتوں کو دہلی کے انصاف پسند بھی تسلیم کریں گے [3]

غرض آزاد کو اس کا اقرار تو کرنا ہی پڑا کہ دہلی والوں نے لکھنؤ والوں کی تقلید کی۔ لیکن ذرا دبی زبان سے مرزا فرحت اللہ بیگ نے اس کو اور

[1] آب حیات ص ۳۷۱ تا ص ۳۷۲ [2] شرح دیوان غالب ص ۱۷۰ تا ۱۷۳
[3] آب حیات ص ۳۷۰

بھی ہلکا کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

غدر کے کچھ پہلے رعایت لفظی کا کچھ اثر لکھنؤ سے دہلی پر
پڑا تھا مگر وہ تھوڑے ہی دنوں میں زائل ہو گیا [1]

مرزا صاحب کے نزدیک لکھنؤ کا جو اثر دہلی پر پڑا وہ
لفظی رعایت تھا وہ بھی بعد میں زائل ہو گیا جس کی حقیقت یہ
غدر سے پہلے جب لکھنؤ کو استقلال کا درجہ ملا تو دہلی میں جن شعراء
نے شہرت کا علم بلند کیا وہ شاہ نصیر، مرزا غالب۔ شیخ ذوق اور
مومن خاں تھے ان سب کا کلام ناسخ سے متاثر ہے۔ گل رعنا کا
مؤلف لکھتا ہے:-

شاہ نصیر تو گویا دہلی کے شیخ ناسخ ہیں جن کے کلام
میں شیخ ناسخ کی تمام خصوصیات موجود ہیں [2]
مومن خاں نے بھی اول اول ناسخ ہی کے رنگ میں
لکھنا شروع کیا تھا چنانچہ ان کے دیوان میں اس رنگ
کے بہت سے اشعار ملتے ہیں۔ ناسخ کے کلام کا غلغلہ بلند
ہوا تو مومن کے ساتھ غالب نے بھی وہی روش اختیار
کی چنانچہ ان کی غزلوں سے یہ روش صاف نمایاں ہے [3]
مضمون آفرینی ذوق کی غزلوں میں بھی ہے [4]

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھنؤ کا دبستان شاعری میں

[1] مقدمہ دیوان انعام اللہ خاں یقین ص ۲ [2] تذکرہ گل رعنا ص ۲۱۸
[3] گل رعنا ص ۲۱۹ گل رعنا ص ۲۲۹

مندرجہ بالا عبارت لکھ کے یہ رائے ظاہر کرتے ہیں:-

جن لوگوں نے غزلوں کے مروجہ اور رسمی مضامین کی
بندشوں سے نکل کر نئے خیالات اور نئے اسالیب پیدا
کرنے کی کوشش کی۔ ان کے امام شیخ ناسخ ہیں۔ نصیر، مومن
غالب۔ ذوق سب کے ذہنی ارتقاء میں ناسخ کے کلام
اور ان کی مثال کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہے، اگرچہ ناسخ نے
اردو غزل کے عام پسند اسلوب کی زیادہ پابندی نہیں کی
تاہم اسے خیال کی وسعت اور مضمون کے تنوع سے
مالا مال کر دیا [1]

ان لوگوں کے بعد ذوق کے شاگردوں میں داغ اور مومن
کے شاگردوں میں تسلیم نے شہرت حاصل کی یہ بھی لکھنؤ کے مقلد تھے۔
اس کے بعد دہلی میں شاعری کا چراغ بجھ گیا۔ پھر وہاں شاعر ہی کون
پیدا ہوا جس کے متعلق کہا جا سکے کہ یہ لکھنؤ سے متاثر ہوا یا نہیں۔
مولوی عبدالباری صاحب آسی فرماتے ہیں:-

میں حضرت داغ کے جناب مولانا ابوالحسن صاحب ناطق
گلاؤٹھوی سے اصلاح لیتا تھا۔ مگر جیسے ہی لکھنؤ میں قدم
رکھا اور مشاعروں کی شرکت کا اتفاق ہوا تو مجھے روز روشن
کی طرح یہ بات معلوم ہو گئی کہ لکھنؤ کی شاعری اوج کمال پر

[1] لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۲۳۶

جاری ہے اور دلی کے اساتذہ صرف سوختی داغ کہن کی وجہ سے گل فروشی کر رہے ہیں باقی کچھ نہیں ہے صرف ہو اہے جواب تک دلی کے نام کو وہ زندہ کئے ہوئے ہے [1]

حضرت نیاز فتحپوری کی بھی یہی رائے ہے :-

(۱) شاگردان غالب کے بعد دہلی میں شاعر ہی کون پیدا ہوا۔

(۲) دہلی میں اب بالکل سناٹا ہے کیونکہ سائل و بیخود باوجود دہلوی ہونے کے شاعری کے لئے ننگ و عار ہیں [2]

اب مرزا صاحب کا قول کہاں تک انصاف پر مبنی سمجھا جا سکتا ہے

لکھنؤ کے استقلال کے بعد جو شاعر دہلی میں ہوئے وہ لکھنؤ سے متاثر تھے ان کا اثر قبول کرنے والوں کے بعد دہلی میں شاعری ہی زائل ہو گئی تو اثر کے زوال کا کیا ذکر تاہم جو لوگ شدید شعر کہتے تھے وہ اپنے بزرگوں کی طرح لکھنؤ کے مقلد تھے جس کی تفصیل آگے آئے گی لیکن جو لوگ لکھنؤ کی اس فضیلت کو برداشت نہیں کر سکتے وہ طرح طرح سے ان کی خصوصیتوں کا وزن کم کرتے رہتے ہیں۔ ہاں جن کا قلم آزاد ہے وہ صاف کہہ دیتے ہیں۔ پروفیسر اعجاز حسین صاحب کے الفاظ یہ ہیں :-

> ناسخ اور آتش نے وہ کمال حاصل کیا کہ دہلی والوں نے بھی ان کو استاد مان لیا۔ بلکہ ان کی تقلید کو ایک زمانہ تک فخر سمجھا [3]

[1] تذکرہ خندۂ گل ص ۹ [2] انتقادیات [3] مختصر تاریخ ادب اردو ص ۲۲۱

ان پرزور لفظوں کی تائید غالب کے اس قول سے ہوتی ہے :-

> میاں! جب ناسخ کا کلام دہلی میں پہونچا جیسا تم نے روئی کے دیوان کا حال سنا ہو گا کہ دلی میں آیا تو جیسے کسی چیز پر لوگ گر پڑتے ہیں اسی طرح اس کے کلام پر گر پڑے ———
> مگر وہ زبان کو نظم کر دیتا تھا اس میں کچھ دقت نہ ہوتی ———
> مگر ناسخ کے کلام نے جس کو علم درکار تھا اور قاعدے کے پرتو پر ڈالا گیا تھا دلی میں آکر سب کو حیران کر دیا اور قاعدے کے ساتھ مطلب کا صاف طور سے ادا ہونا دلوں کو برانگیختہ کرنے لگا ———
> یہاں تک کہ شعراء نے اس کو رغبت کی نگاہ سے دیکھا ———
> یاد رہے کہ زبان لکھنؤ کی مستند ہے [1]

غالب کے اس قول کو حضرت اثر عظیم آبادی نے ان لفظوں میں نقل کیا ہے :-

> اپنی غزل سرائی کی نسبت حضرت (غالب) فرماتے تھے کہ میری غزل گوئی کی ابتدا تھی کہ ناسخ مرحوم کا دیوان دہلی میں پہلے پہل پہونچا۔ شیخ کی سخن سنجی کی تمام شہر میں دھوم مچ گئی۔ میں نے اور مومن نے ان کا متبع ہونا چاہا [2]

یہ غالب کا قول ہے جو ہمیشہ عام گزرگاہ سے ہٹ کر اپنا راستہ نکالتے تھے لیکن ناسخ کے نقش قدم پر چلنے کا اقرار کرتے ہیں کیا یہ اتباع صرف لفظی رعایت میں تھا؟ اس کا دعویٰ کرنے والوں کی

[1] تذکرہ جلوۂ خضر جلد اول ص ۲۳۶ [2] کاشف الحقائق

سادہ لوحی بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اس کے
موجد ہی ناسخ تھے ان سے پہلے کسی کو اس کا علم نہ تھا حالانکہ
دہلی میں شاعری کی بنیاد اسی اینٹ پر رکھی گئی تھی۔ مصحفی کا بیان ہے
کہ :۔

درابتدائے شوق کہ ہنوز میر و مرزا کسے درعرصہ وجود دنیا مدہ بود
دور دور ابہام گویاں بود

میر حسن اپنے تذکرہ میں محمد شاکر ناجی کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"تلاش صنعت ابہام بسیار داشت"

تذکرہ گل رعنا کے مولف کے الفاظ یہ ہیں :۔

ابہام ذومعنین جو قدماء کی شاعری کا مایۂ ناز ہے ۔

شاہ مبارک آبرو کے حالات میں لکھتے ہیں :۔

حق یہ ہے کہ دہلی میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز انہیں
سے ہوا۔ اس زمانہ کے دستور کے مطابق تشبیہ اور ابہام
میں کلام الجھا ہوا ہے ۔

مرزا علی لطف نے گلشن ہند میں آبرو کے حالات میں لکھا ہے :۔

بیشتر اشعار انھوں نے ابہام کے کہے ہیں ۔
محمد شاکر ناجی کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"بطور قدما کے طرز ابہام میں کرتا طبع آزمائی ہے"

کیوں کر یقین کروں کہ اتنے بڑے بڑے نقادان فن ناسخ کے کلام
کی خصوصیت صرف لفظی رعایت سمجھتے ہیں اور ہوش و حواس کے عالم میں
ہیں۔ جس کلام نے اپنے وقت اور اپنے بعد کے تمام شعراء اور ادباء کو

[illegible] دیا ہو اس کی حقیقت بس اتنی ہو اور یہ متاثر ہونے والے
[illegible] ؟

ناسخ کی شخصیت

حقیقت یہ ہے کہ جس وقت زبان بھونڈی لفظوں بھدی ترکیبوں
[illegible] فقروں اور غلط لفظوں سے خارزار اور شاعری پست،
[illegible] خیالات ۔ عامیانہ اور سوقیانہ لفظوں سے داغدار تھی۔ اس
[illegible] فطرت کی فیاضی نے ناسخ کو ایک پیغمبر سخن اور ایک مجدد فن
[illegible] زبان کی حیثیت سے ایسا سلیم ذوق اور اتنا پر ایجاد ذہن
[illegible] جو دنیا میں کسی شاعر کو نہیں ملا۔ اور اسی عطیہ فطرت
[illegible] انھوں نے اپنی ایجادوں، اصلاحوں اور اختراعوں سے
[illegible] و شاعری میں اتنی خوبیاں بھر دیں جو اس سے پہلے اُس میں نہ
[illegible] اور وہ ایک نئی شکل و صورت میں رعنائی اور دلربائی کے
[illegible] آئی اسی لئے وہ ایک طرز جدید کے موجد اور طرز قدیم
[illegible] کہے جاتے ہیں اور کسی چیز کو ایک نئی صورت بخشنا ہر دل
[illegible] کا کام نہیں ایسی شخصیت صدیوں میں بھی نہیں پیدا ہوتی۔
ناسخ کے کارناموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کے کسی
[illegible] اپنی زبان و شاعری میں اتنی اصلاحیں نہیں کیں جتنی
ناسخ نے کیں۔ اجمالاً ان کے کارنامے ملاحظہ ہوں۔

پہلا کارنامہ | پہلا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو کو ایک مستقل
زبان بنا دیا۔ ورنہ ان سے پہلے وہ انداز بیان

اور اجزائے جملہ کی ترتیب میں فارسی نحو کی تابع تھی اس سے کلام میں تعقید اور گنجلک پیدا ہو جاتی تھی۔ ناسخ نے اسی عیب کو دور کیا یعنی زبان کی ساخت کے موافق اجزائے جملہ کی ترتیب ایسے سلیقہ سے قائم کی جس سے فصاحت اور سلاست پیدا ہو گئی اور خود اس کی نحو کے قاعدے بنائے جا سکے۔

مثال میں میر امن دہلوی کی باغ و بہار سے چند فقرے پیش کئے جاتے ہیں انہیں کے مقابل لکھنؤ کی درست کی ہوئی زبان بھی ملاحظہ ہو۔

دہلی کی زبان	لکھنؤ کی زبان
ایسی ایسی تباہی کھا کے ویسے شہر سے کہ وطن اور جنم بھوم میرا ہے اور اول نال وہیں گڑا ہے جلا وطن ہوا۔	ایسی ایسی تباہی اٹھا کے اس شہر سے جلا وطن ہوا جو جو میرا جنم بھوم ہے اور جہاں میری آنول نال گڑی ہے۔
منشی میر بہادر علی جی کے وسیلے سے حضور تک جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کے رسائی ہوئی ہے ۱؎	منشی میر بہادر علی صاحب کے وسیلہ سے جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کے حضور تک رسائی ہوئی۔
وہ گھر میں تلپھے ہے اور یہ قفس میں تڑپھے ہے اے عزیزس! میں بادشاہ زادہ جگر سوز اس اقلیم نیمروز کا ہوں احوال شہزادے کے طالعوں کا دیکھو۔ ایک استاد دانا کار آزمودہ واسطے میری تربیت کے متعین کیا ۲؎	وہ گھر میں تڑپتا ہے اور یہ قفس میں پھڑکتا ہے۔ اے عزیزس! میں جگر سوز اس اقلیم نیمروز کا شہزادہ ہوں۔ شہزادے کے ستاروں کا حال دیکھو ایک دانا اور کار آزمودہ استاد میری تربیت کے واسطے معین کیا۔

۱؎ مقدمہ باغ و بہار مطبوعہ انتظامی پریس کانپور ص ۵

فارسی میں مضاف الیہ مضاف کے بعد آتا ہے جیسے "وطن ما" بالکل اسی قاعدے پر میر امن لکھتے ہیں :–

"وطن اور جنم بھوم میرا ہے"

ناسخ کے نزدیک یہ ترکیب فصیح نہ تھی اس لئے انھوں نے اس کو الٹ دیا یعنی میرا وطن اور جنم بھوم صحیح قرار دیا اس سے معلوم ہوا کہ قدیم اردو میں نحوی ترتیب کا کوئی قاعدہ نہ تھا بلکہ وہ فارسی کی انگلی پکڑ کر راستہ چلتی تھی ممکن ہے اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ میر امن نے قصہ چہار درویش کا ترجمہ کیا ہی ہے لیکن ترجمہ کے لئے مسند و مسند الیہ کی ترتیب میں اصل کی متابعت ضروری نہیں چنانچہ اس کتاب میں بھی لفظی ترجمہ کہیں بھی نہیں کی گئی اس کا ثبوت ایک یہی ہے کہ قصہ کا نام تک بدل گیا کہاں چہار درویش کہاں باغ و بہار اصل سے کوئی بھی مناسبت ہے میر امن خود لکھتے ہیں :–

جان گلکرسٹ صاحب بہادر نے ـــــ لطف سے فرمایا کہ قصہ کو ٹھیٹ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ ہندو

۲؎ باغ و بہار دوسرے درویش کی سیر ص ۱۱۱–۱۱۲

مسلمان عورت مرد لڑکے بالے خاص و عام بولتے چالتے ہیں
ترجمہ کرو موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورے میں لکھنا
شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے[1]

مولوی عبدالحق صاحب بی اے سیکرٹری انجمن ترقی اردو نے باغ و بہار
پر جو مقدمہ لکھا ہے اس میں ثابت کر دیا ہے کہ باغ و بہار فارسی قصہ کا ترجمہ
نہیں ہے بلکہ اس کا ماخذ (اردو کی کتاب) نوطرز مرصع ہے جس میں چار درویش
کا قصہ بیان کیا گیا ہے وہ لکھتے ہیں :-

اصل یہ ہے کہ ترجمان دونوں میں (نوطرز مرصع اور باغ و بہار)
سے کوئی بھی نہیں فارسی قصہ کو اپنی اپنی زبان میں بیان کر دیا ہے
لیکن جہاں کہیں نوطرز مرصع اور فارسی کتاب میں اختلاف ہے
باغ و بہار میں نوطرز مرصع کا اتباع کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا
ہے کہ باغ و بہار جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے فارسی قصہ کا ترجمہ
نہیں ہے بلکہ اس کا ماخذ نوطرز مرصع ہے بعض بعض مقامات
پر تو الفاظ اور جملے کے جملے وہی لکھ دیئے ہیں جو نوطرز مرصع میں ہیں[2]

اس کے علاوہ ہم نے ایسے فقرے بھی لکھ دیئے ہیں جو خاص میر امنؔ کے
ہیں اور اصل قصہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اب رہا میر امن کی زبان کے
مستند ہونے کا مرحلہ تو اس میں کسی کو شک نہیں۔ سر سید احمد خاں کا
قول ہے کہ :-

---

[1] باغ و بہار دوسرے درویش کی سیر ص ۱۱۱ - ۱۱۲
[2] مقدمہ باغ و بہار از مولوی عبدالحقؔ صاحب بی - اے -

"جو مرتبہ نظم میں میر تقی میر کو حاصل ہے وہی میر امنؔ کو نثر میں ہے"

مولوی عبدالحق صاحب بی - اے کی رائے ہے :-
باغ و بہار اپنے وقت کی نہایت فصیح اور سلیس زبان میں لکھی
گئی ہے میر امنؔ خاص دلی کے رہنے والے ہیں اور ان کی زبان
ٹھیٹ دلی کی زبان ہے اور ان کا لکھا سند ہے ———
اردو کی پرانی کتابوں میں کوئی کتاب زبان کی فصاحت اور
سلاست کے لحاظ سے اس کا لنگا نہیں کھاتی ———
مصنف کو زبان پر بڑی قدرت ہے[2]

مولوی سید محمد صاحب ایم اے لکچرار سٹی کالج حیدرآباد دکن لکھتے
[illegible]

میر امنؔ خاص دہلی کے باشندے تھے اردوئے معلیٰ ان کی
زبان تھی۔ باغ و بہار انھوں نے اسی ٹکسالی زبان میں لکھی
ہے[3]

اس پر بھی اگر کسی کو اختلاف ہو تو وہ مرزا غالب کی یہ عبارت
دیکھے :-

مہر اور خورشید یہ دونوں اسم آفتاب کے ٹھہرے جب عرب و عجم
مل گئے تو اکابر عرب نے کہ منبع علوم ہوئے واسطے رفع التباس
کے فارسی ماو معدولہ بڑھا کر لکھنا شروع کیا۔ ہر آئینہ متاخرین
نے اس قاعدے کو پسند کیا (ادبی خطوط غالب ص ۹۵)

---

[1] اس کا لنگا نہیں کھاتی غلط ہے - اس سے لگا نہیں کھاتی ہونا چاہیے -
[2] مقدمہ باغ و بہار [3] ارباب نثر اردو

اس عبارت میں اجزائے جملہ کی ترتیب فارسی نحو کے مطابق ہے۔
اسی چیز کو سب سے پہلے ناسخؔ نے ترک کیا اور خود اردو کے لئے
ایسی ترتیب وضع کی کہ اس کی نحو مستقل طور پر بن سکی۔

دوسرا کارنامہ | ناسخؔ کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے عربی فارسی لفظوں کے تصرف میں ایسے سلیقہ سے کام
لیا کہ فارسیت پیدا نہیں ہونے پائی بلکہ عربی فارسی لفظیں بھی اردو لفظوں
کے ساتھ ترکیب میں اس طرح واقع ہوئیں کہ اُن کی مجموعی ہیئت
سے اردو کی شان پیدا ہو گئی۔

حضرت اثر عظیم آبادی لکھتے ہیں:۔
شیخ امام بخش ناسخؔ زبان اردو کے مصلح گزرے ہیں اس
اعتبار سے ان کا تخلص نہایت حسب حال ہے۔ شیخ نے
اردو کو خراش تراش کے ایسا درست کیا کہ اب اُس کی لطافت
اور صفائی فارسی سے کچھ کم نہیں معلوم ہوتی ہے۔ ذوقؔ
نے صرف مضمون آوری کی طرف اپنی توجہ مبذول رکھی۔
اور اصلاح زبان کی طرف مطلق مائل نہ ہوئے۔ مومنؔ کو
بھی اس جانب کچھ توجہ نہ ہوا۔ غالبؔ نے تو فارسی کی اس قدر
آمیزش کر دی کہ اردو پر فارسی کا شبہ ہونے لگا۔ حضرت غالبؔ
نے فارسی زبان یا فارسی جملوں کو اس طرح باندھا کہ
اردو فارسی نما ہو گئی۔ اس کے برخلاف شیخ نے گو الفاظ
فارسی سے اجتناب نہیں کیا مگر ترکیب ایسی ملحوظ رکھی کہ
اردو اردو رہ گئی بلکہ اگر فارسی جملہ کو بھی اپنے کلام میں جگہ دی

[illegible] اردو کر کے دکھا دیا مثلاً ؎
سوالِ وصل پہ ہلنا پرو تیرے ابرو کا
اشارہ ہے براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو کا
لاریب زبان اردو شیخ کی کوششوں کی تمام تر ممنون ہے
اگر جناب شیخ کو اصلاح زبان کی طرف توجہ نہ ہوتی تو زبان حال
کی [illegible] صورت پیدا نہ ہوتی [1]

تیسرا کارنامہ | تیسرا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے صرف و نحو کے لحاظ سے زبان کا صحیح استعمال بتایا ان سے پہلے مصحفیؔ و انشاءؔ
[illegible] حروفِ عطف، حرف ربط حرف اضافت۔ علامات
[illegible] وغیرہ کا ترک کر دینا جائز تھا مثلاً۔

[illegible] سودا کو سنا بولتے یارو۔ اللہ رے اللہ رے کیا زور بیاں ہے — سوداؔ
[illegible] کی مسیحائی ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا — میرؔ

برقع کو اٹھا چہرے سے وہ بت اگر آئے
اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آئے — میرؔ

پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے
رہے گا حشر تک ماتم ہمارا — میرؔ

[illegible] کی زبان میں میں نے حضرت سودا کو بولتے سنا۔ مر کے دیکھا
[illegible] سے اٹھائے۔ رو رو کے پڑھیں گے۔ صحیح ہے۔

[1] کاشف الحقائق

صفیر بلگرامی نے اپنے تذکرے کے دوسرے حصہ میں ناسخ کے کلام سے ایسے قاعدے اخذ کرکے تفصیل سے لکھے ہیں۔ اور ایک جگہ پر یہ اصول بھی لکھدیا ہے :۔

"قواعد اردو میں نثار علی بیگ نے قواعد کے بیان میں لکھدیا ہے کہ عبارت فصیح و بلیغ وہ ہے کہ قواعد صرف و نحو کی رو سے اس میں غلطی نہ ہو اور مضمون سمجھنے میں دقت نہ ہو اسی اصول کو ناسخ نے قائم کیا تھا اور اسی کا فخر ان کو ہے اور اسی سبب سے وہ اس طرز جدید کے موجد کہلائے جس کی تقلید ہندوستان نے کیا دہلی نے کی اور حق پسندوں نے اس کے حق کو کبھی نہیں چھپایا"[1] (جلوہ خضر)

چوتھا کارنامہ

ناسخ کا چوتھا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے عربی فارسی لفظوں کی صحت کو ضروری قرار دیا۔ مصحفی و انشاء کے زمانہ تک اس کا لحاظ نہ تھا وانہ بلکہ ایسی لفظیں عام طور سے مروج تھیں اور کلام کو فصاحت کے درجہ سے گرا دیتی تھیں۔

پانچواں کارنامہ

پانچواں کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے بھونڈی اور بھدی لفظوں اور ترکیبوں کو زبان کی ساخت کے موافق فصاحت کے سانچے میں ڈھال کے سبک لطیف اور شیریں بنا دیا یا ترک کر دیا مثلاً جنھوں کے آگے۔ تجھ تیغ۔ مجھ پاس، لوہو وغیرہ کی سی بے شمار لفظوں اور ترکیبوں کو جو اس وقت زبان میں مستعمل تھیں اور ان کی بدنمائی کا احساس کسی کو نہ تھا ناسخ کے ذوق سلیم نے اس کو محسوس کیا اور تراش خراش کے فصیح بنا لیا۔

[illegible] شبلی تحریر فرماتے ہیں :۔

"بہت سے بدمزہ اور ناگوار الفاظ مثلاً ...... ناسخ کے زمانہ میں عموماً مروج تھے اور تمام شعرائے دہلی اور لکھنؤ ان کو برتتے تھے لیکن ناسخ کے مذاق صحیح نے برسوں بعد کے آنے والی حالت کا پہلے سے اندازہ کر لیا اور ایسے تمام الفاظ ترک کر دیئے جو بالآخر دلی والوں کو بھی ترک کرنا پڑے"[1]

چھٹا کارنامہ

چھٹا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے الفاظ کی تذکیر و تانیث انتہائی قابلیت سے معین کی۔ اب ایک ایسی فصیح و [illegible] و رفتہ زبان بن گئی جس میں آؤں ہوں۔ لعل بیج۔ انکھڑیاں [illegible] راتوں اٹھ اٹھ روتا ہوں۔ جنھوں آگے۔ تجھ تیغ۔ مجھ پاس [illegible] سودا کو سنا بولتے۔ سچ ہے میر دیوانہ تھا۔ دل اپنے کو نہ پایا۔ [illegible] تھا نہیں رہ گیا۔ اسی زبان نے تمام ہندوستان کے شاعروں اور [illegible] ازوں کو تقلید پر مجبور کر دیا۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب لکھتے ہیں :۔

"[illegible] زبان کو اگر زبان کردہ کھایا تو لکھنؤ والوں نے اور لکھنؤ میں ناسخ نے"

حضرت اثر عظیم آبادی بھی غالب کے موید ہیں :۔

(۱) ناسخ نے اردو کو اپنے کلام بلاغت نظام سے ایک پاکیزہ اور شستہ زبان بنا ڈالا۔

(۲) فی الواقعی جیسی ترقی اردو کو ناسخ کی بدولت نصیب ہوئی ایسی کسی دوسرے شاعر کی بدولت ظہور میں نہیں آئی۔ بے شک اردو

[1] موازنہ انیس و دبیر — [2] تذکرہ جلوہ خضر جلد اول صفحہ ۲۳۶

ناسخ کا بڑا احسان ہے۔ اگر ناسخ نہ ہوتے تو جیسی زبان
لکھنؤ کی فصیح و شستہ ہو رہی ہے یہ خوبیاں اُسے نصیب
نہ ہوتیں۔

(۳) ناسخ نے اردو کو تراش خراش کے ایسا درست کیا کہ اب
اس کی لطافت فارسی سے کم نہیں معلوم ہوتی۔ (کاشف الحقائق)
انھیں خصوصیتوں کے لحاظ سے مرزا رجب علی بیگ سرور نے
کہا ہے ؎

بلبل شیراز کو ہے رشک ناسخ کا سرور
اصفہاں اُس نے کئے ہیں کوچہ ہائے لکھنؤ

دہلی کے حلقہ بگوشوں نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے ___ نسیم د
کے شاگرد منشی امیر اللہ تسلیم کہتے ہیں :-

رشک موج آب کوثر ہے زبان لکھنؤ

حقیقت یہ ہے کہ ناسخ کی شخصیت اس لحاظ سے بالکل
منفرد نظر آتی ہے۔ کسی شخصی کوشش نے دنیا کی کسی زبان کو ا
درست نہیں کیا بلکہ صدیوں کی کوششیں اور ی کاوشیں
زبان کو ایک رنگ پر لاتی ہیں جو خوبیاں اور زبانوں کو مدتوں میں نصیب
ہوئیں وہ اردو کو ناسخ سے چند روز میں حاصل ہو گئیں اور اس نے
اپنے سن سے اتنی زیادہ ترقی کر لی کہ لوگوں کو حیرت ہو گئی۔ مولوی
عبدالسلام صاحب ندوی لکھتے ہیں :-
آیا اصول ارتقا کے لحاظ سے کسی زبان میں دفعۃً اتنا تغیر

ہو سکتا ہے یا نہیں؟ یہ ایک نہایت اہم سوال ہے جس کو ایک
داستان کے پردہ میں اس طرح پیش کیا گیا ہے۔ ناسخ اور میر کی زبان
میں جس قدر فرق پایا جاتا ہے اتنا زمانہ میں نہیں پایا جاتا تو اتنا جلد
زبان کے بدل جانے کا کیا سبب ہوا ؟

اب ہر شخص ناسخ کے کمال کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ انھوں
نے زبان کو اتنا درست کیا کہ اپنے بعد آنے والی نسلوں سے
اصلاح کا کام چھین لیا۔ اس خیال کی تائید میں مولانا شبلی کا قول پیش
کیا جا سکتا ہے کہ ناسخ کے مذاق صحیح نے برسوں کے بعد آنے والی حالت
کا پہلے سے اندازہ کر لیا اس وجہ سے زبان نے اپنے سن سے زیادہ ترقی
کر لی اور ایسی بااصول بن گئی جس کی پیروی ہر شخص کو کرنا پڑی جو مذاق
میں کوئی ایسی قوت تھی جو دوسروں کو تقلید پر مجبور کر سکتی۔ یہ کمال کا زور تھا
کہ انھوں نے کچھ قاعدے ایسے بنا دیئے جن کی پابندی نہ کرنے سے کلام
فصاحت کے درجے سے گر جائے اس سے مجبور ہو کے ہر شخص کو تقلید
کرنا پڑی۔ اس طرح سارا ملک ناسخ سے متاثر ہو گیا۔ صفیر بلگرامی
نے ان کے تصرفات کی مقبولیت کا راز یہی بتایا ہے :-

ناسخ کے تصرفات ایسے مقبول ہوئے جو آج تک جاری
ہیں اور ہمیشہ جاری رہیں گے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ناسخ
کے تصرفات اصول سے ہوئے ___ بعد ناسخ کے کتنی کتابیں
اس اصول پر تحریر کرنا لوگوں لوگوں کو آسان ہو گیا اور وہ اصول
قاعدہ صرف و نحو ہے جو زبان کی جان اور اصل اصول ہے مگر
دہلی میں اس کا خیال نہ ہوا اور میر لکیر کے فقیر ہمیشہ رہے۔ یہی

وجہ ہے کہ دہلی کی زبان میر تقی کی روش پر رہی اور بڑھ نہ سکی مگر
اس کو درست کیا تو ناسخ نے لکھنؤ میں درست کیا اور تصرفات
لائقہ سے اس کو بھر دیا جو لوگوں کے لئے اب آسان رستہ ہو گیا
غرض یہ کہ زبان صرف و نحو سے درست ہو کے ہر جگہ یکساں بولنے کے
قابل ہو گئی اور ہر ایک قصد کرنے والا اس کا عامل بن گیا یہاں تک کہ
بہت سے شہروں کی زبان عموماً ایک ہی طرح کی بن گئی۔ دیکھو
صرف و نحو کی کتابیں جو لکھی گئی ہیں وہ لکھنؤ کی زبان کے اصول
پر۔ اسی سے لکھنؤ کی قابلیت ظاہر ہے ——— ناسخ نے
صرف و نحو کے اصول پہ زبان کو ڈھال دیا۔ جو ایک طرح سے
تمام ملک میں سکھائی جا سکتی ہے ——— میرا مقصد
اس اصلاح سے یہ تھا اور اسی اصلاح کا فخر لکھنؤ کو حاصل
ہے اور حاصل رہے گا۔ جس کا تمام ہندوستان بلکہ دہلی بلکہ جہاں
جہاں جس جس مقام پر اردو کی تعلیم ہوتی ہے ممنون احسان ہو گیا [1]
غالب نے بھی اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے :-

قاعدہ کے ساتھ مطلب کا صاف طور سے ادا ہونا دلوں کو
برانگیختہ کرنے لگا۔

مولوی عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں :-

(۱) اسی دور نے ترقی کر کے متوسطین کے زمانہ میں شیخ ناسخ جیسا
مصلح و مجدد فن پیدا کیا جنھوں نے الفاظ کی تنقیح و تہذیب نہایت

۱؎ تذکرہ جلوۂ خضر جلد اول

[illegible] کر دی اور ان کے بعد کے شعراء اسی زبان کی پیروی کرتے ہیں۔
(۲) ناسخ نے زبان کو نہایت مہذب اور شائستہ بنا دیا اور آج تمام شعراء
اسی زبان کے مقلد ہیں [1]

صفیر بلگرامی کا قول ہے :-

چنانچہ انصاف پسند اور صاحبان ادراک ہیں سب جانتے ہیں کہ
اس وقت کی زبان جو تمام ہندوستان میں شعراء و فصحا کے
برتاؤ میں ہے لکھنؤ کی درست کی ہوئی ہے۔ اسی پہ قواعد
کی کتابیں درست ہوئی ہیں [2]

جب زبان با اصول اور اصول مقبول ہو چکے تو اب جو قلم اٹھائیگا
وہ پہلا ارادہ لکھنؤ کا مقلد بن جائے گا۔ چنانچہ ناسخ کے بعد ملک کے انشاء
پردازوں میں ایک بھی ایسا نہیں پیش کیا جا سکتا جس نے ان
کے مقرر کئے ہوئے قاعدوں کی خلاف ورزی اور ان سے پہلے کی زبان
استعمال کی ہو اس طرح سارے ملک پر لکھنؤ کی زبان چھا گئی۔ اب کوئی تغیر
ہو گا وہ جزوی ہو گا۔ اسی بناء پر صفیر بلگرامی لکھتے ہیں کہ :-

اب جو تغیر ہو گا وہ لکھنؤ کی درست کی ہوئی زبان سے باہر نہ ہو گا۔
دہلی کی زبان کو لکھنؤ کی زبان پر ترجیح دینے والے بھی عملاً لکھنؤ
کا اتباع کرتے ہیں۔

زبان کی اصلاح کے لحاظ سے ناسخ کے کارنامے آپ ملاحظہ
فرما چکے، معنوی اعتبار سے انھوں نے شاعری میں کیا انقلاب پیدا

۱؎ شعرالہند ۲؎ تذکرہ جلوہ خضر جلد اول ص ۲

اس کو بھی اجمالاً سن لیجئے

(۱) بازاری۔ عامیانہ۔ مبتذل اور اوباخانہ لفظیں مضامین اور انداز بیان کو معیوب قرار دیا۔ صفیر بلگرامی لکھتے ہیں:۔

ناسخ نے اردو شاعری کو مہذب کر دیا۔ یعنی پوچ اور مبتذل اور بے حیائی کے مضمون جو انشاء اور سودا کے کلام میں بے انتہا اور دوسروں کے کلام میں کم و بیش ہیں وہ بالکل متروک کیے
(جلوۂ خضر جلد اول صـ۴۷)

رام بابو سکسینہ کہتے ہیں:۔

نامہذب اور فحش الفاظ جو قدماء کے کلام میں پائے جاتے تھے تھے انھوں نے خارج کر دیئے۔ (تاریخ ادب اردو صـ۲۷۲)

(۳) ہجو گوئی جس کی بنیاد بدتہذیبی اور بداخلاقی پر ہے اس کو ایسا معیوب و متروک قرار دیا کہ پھر کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی صفیر بلگرامی لکھتے ہیں
آپس کی ہجوؤں کی جڑ کاٹ دی صـ۴۷

(۴) غزل کے دائرہ کو وسیع کر کے اخلاقی معاشرتی۔ سیاسی اور فلسفیانہ مضامین کے لئے راستہ بنا دیا۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکچرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا یہ قول آپ کی نظر سے گزر چکا ہے کہ:۔

جن لوگوں نے غزل کے مروجہ اور رسمی مضامین کی بندشوں سے نکل کر نئے خیالات اور نئے اسالیب پیدا کرنے کی کوشش کی ان کے امام شیخ ناسخ ہیں

(۵) دقیق خیالات کو آسانی سے ذہن نشین کرنے کی صلاحیت

[illegible] ہوئی

(۶) [illegible] آفرینی اور نازک خیالی سے طرز ادائے مطلب کے صدہا طریقے [illegible]

(۷) صنائع لفظی و معنوی جو بقول مولانا شبلی ایوان شاعری کے نقش و نگار ہیں نہایت خوش سلیقگی سے اپنے کلام میں پیدا کیے

ان اصلاحوں سے شاعری کی دنیا [illegible] غزل و مضامین کے [illegible] زبان کی فصاحت و بلاغت کے ساتھ [illegible] نزاکت سنجیدہ شوخی۔ بلند [illegible] لطافت۔ انداز بیان میں سادہ پرکاری کے ساتھ لطیف دل آویز اور شاعر نواز بن گئی۔ یہ خوبیاں پہلے اس میں نہ تھیں اور یہی وہ دلفریبیاں تھیں جنھوں نے تمام ہندوستان کی زبان و شاعری کو متاثر کر دیا۔ دہلی کے شعراء میں جس کا دیوان اٹھا لیجئے آپ کو ناسخ کی زبان و شاعری کی تقلید نظر آئے گی۔ مثال میں غالب ہی کا مختصر دیوان لے لیجئے۔ ناسخ [illegible] ہے

[illegible] تھم جائیں جو فرقت میں تو آہیں نکلیں — خشک ہو جائے جو پانی تو ہوا پیدا ہو

غالب کہتے ہیں ہے

ضعف سے گریہ مبدل بدم سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

ناسخ ہے

ابھی خورشید جو چھپ جائے تو ذرات کہاں
تو ہی پنہاں ہو تو پھر کون بھلا پیدا ہو

غالب ہے

ہے تجلی تیری سامانِ وجود — ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

اس طرح کی مثالیں اگر ذوق و مومن کے دیوان میں ڈھونڈھی جائیں تو ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ مومن اور غالب کے بہترین اشعار وہی ہیں جن میں ناسخ کی زبان و شاعری کا تتبع کیا گیا ہے ؎

غالب

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

مومن ؎

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی
اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا — رنج راحت فزا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو — عذر کچھ چاہیے ستانے کو
برق کا آسمان پر ہے دماغ — پھونک کر میرے آشیانے کو

اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ
ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے کئی بے جاں ہوں گے

ذوق ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

معاصرین میں نصیر۔ ذوق۔ مومن۔ غالب نے تو تقلید کی ہی بعد کو آنے والوں کا متاثر ہونا فطری تھا۔ کمال کا زور دیکھیے کہ ناسخ سے پہلے کملتا ہو جن کے سامنے پرانی زبان و شاعری موجود تھی اور ایک عمر تک وہ اس سے کھیل چکے تھے ان کی اس صاف زبان اور سنجیدہ شاعری سے متاثر ہو گئے۔ مصحفی ایسے جگت استاد کا میرِ مشاعرہ ناسخ کو اس طرح کا طلب کرنا کوئی معمولی بات نہیں ؎

ہاں مگر شیخ کی خدمت میں ہے اپنا سوال
پڑھ چکے ہم تو کچھ اب آپ عنایت کیجیے

ناسخ کے کمال کی انتہا دیکھیے کہ مصحفی ایسا باکمال استاد اپنے چھٹے دیوان کے مقدمہ میں ان کی تقلید کا صاف لفظوں میں اقرار کرتا ہے:-

غزلیات ایں دیوان ششم را کثرے بر رویہ ایشاں
(ناسخ) گفتہ

معاصرین میں غالب ایسا مغرور شاعر جو شعرائے فارس میں چند اور اردو میں بہت کم کی حقیقت سمجھتا۔ ہر چیز میں اپنے لئے ایک نیا راستہ

پیدا کرتا۔ کسی کی جھوٹی تعریف کو کفر کہتا اور اپنے لئے ننگ سمجھتا ہے۔ ناسخ کے کمال کے آگے سر جھکا دیتا ہے اور ان کو موجد و مجدد و مصلح زبان تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ عبدالغفور نساخ کو ایک خط میں اس طرح لکھا ہے:

ہم فقیر لوگ اعلائے کلمۃ الحق میں بے باک اور گستاخ ہیں
شیخ امام بخش ناسخ طرزِ جدید کے موجد اور پرانی ناہموار روش
کے ناسخ تھے۔

ظاہر ہے کہ طرزِ جدید سے وہی طرز مراد ہے جس کے موجد ناسخ تھے جو اس وقت کی شاعری کا عام پسند انداز تھا اور خود غالب بھی اسی کے پیرو تھے۔ چنانچہ غالب نے خود ناسخ کو اپنے دیوان کے ساتھ جو خط بھیجا ہے اس کے ایک ایک لفظ سے وہی عقیدت جھلکتی ہے جو ایک لائق شاگرد کو اپنے باکمال استاد سے ہونا چاہیئے۔

غالب کا خط ناسخ کے نام

ایں در قبائے بخوں جگر نگار بستہ ارمغانیست لغالب جگر خستہ بحضرت خدام والا احتشام سخن سنج معنی بنا پاں امیدگاہ نظامی نظام ظہوری ظہور۔ نظیری نظیر۔ فیضی فیض۔ ضمیری ضمیر شانی شان۔ نوائی نوا۔ فغانی فغاں۔ در علم صائب و در عل راسخ۔ مخدوم معظم و مطاع مکرم مولانا ناسخ کہ در سخن طرح نوی ریختہ و در ریختہ نقش بدیع انگیختہ او۔ فرستادن ایں فہرست نادانی بداں داناں رموز گانہ ازاں رو است کہ طبع آہنگ نمائش و ہمت بعرض تجمل گرائش دارد۔ بلکہ نامہ نگار

دریں پردہ سگالی است کہ تیرہ بخت ایں تیرہ سرانجامان قلمرو تحریر ملمعان نگاہ قبول مولانا روشنے اندوزد۔ انچہ بگزلک انصاف قابل ازیں اوراق بسترن نرسیدہ است بطرازہ تحسین مخدوم رخ امتیاز افروزد۔

غالب متاخرین میں سب ان کی استادی کا جن لفظوں میں اعتراف کرتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ ان کے شاعرانہ کمال سے کس درجہ متاثر ہیں۔

دہلی کے مستند شاعر مرزا قادر بخش صابر گلستانِ سخن میں اس طرح مدح سرائی کرتے ہیں۔

"فرسنہ ہزار اس کے نامہ نخرہ سے زلہ بار۔ دعویداران کمال اس کے شوکت الفاظ سے پائمال۔ اہل انصاف اس کو استاد مانتے ہیں اور ارباب فہم اس کے شعر کو سحر جانتے ہیں۔"

دہلی کے سب سے بڑے نقاد اور سخن فہم نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ گلشن بے خار میں یوں گل افشانی کرتے ہیں:۔

"نسیم طبعش نکہت ریز۔ شمیم گل فکرش دل آویز۔ طائر بلند پرواز فکرش جز بشاخ سدرۃ آشیانہ نسازد و مرغ تیز بال خیالش جز بہ بام فلک جلوہ نیا نداز د۔ والا مایہ۔ بلند اندیشہ۔ نازک خیال و در تلاش مضمون تازہ و معنی سیراب بے مثل و بے مثال"۔

مولوی محمد علی خاں خاتمہ دیوان ناسخ میں لکھتے ہیں:۔

شاعرِ بے مثال۔ نازک خیال جس نے مضامین کے طائرِ بلند کو بے کھٹکے رشتۂ فکر میں باندھ لیا۔ ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ شعر گوئی کا ڈھرا بتایا رہروں کو سیدھا راستہ دکھایا جو چاہے بے دھڑک چلا جائے۔ کہیں نہ بھٹکے۔ اگلے ریختہ گویوں کے کلام کا بے شک ناسخ ہے۔

(دیوانِ ناسخ مطبوعہ نولکشور پریس ۱۸۷۲ء)

حاصلِ بحث یہ ہے کہ دہلی والوں نے لکھنؤ کی تقلید کی صرف و نحو میں لفظوں کی اصلاح میں۔ تذکیر و تانیث میں۔ متروکات میں وسعتِ مضامین میں۔ معنی آفرینی میں۔ مرصع نگاری میں اور تقلید کا یہ سلسلہ ناسخ کے بعد بھی جاری رہا کیونکہ انھوں نے جس اصول سے زبان کو درست کیا تھا اسی اصول سے ان کے شاگردوں نے اصلاح کا کام جاری رکھا جس سے زبان درست ہوتی رہی اور دہلی والے تقلید کرتے رہے۔ صفیر بلگرامی نے جلوۂ خضر میں لکھا ہے کہ:-

جناب ناسخ سے بسبب اصلاح تازہ کے جو باتیں رہ گئی تھیں ان کو ناسخ کے شاگردوں میں مخصوص رشک نے جاری کیا

شعر الہند کے مصنف نے اس کو اور تفصیل سے لکھا ہے:-

ناسخ اور آتش کے تلامذہ نے بے شبہ الفاظ کی روانی اور برجستگی پر زیادہ توجہ کی اور توسیع زبان کے لئے زیادہ تر اردو ہی کے الفاظ استعمال کئے۔"

اور ایک مقام پر اس سے زیادہ تفصیل سے لکھا ہے:-

شیخ ناسخ اور خواجہ آتش کے بعد اردو زبان اور شاعری

کی اصلاح میں جو کمی رہ گئی تھی اُس کو اُن کے تلامذہ نے نہایت جامعیت کے ساتھ پورا کیا مثلاً انھوں نے ——

(۱) عربی اور فارسی کے الفاظ کو بہت کم کر دیا جس سے زبان بالکل خالص اور بے میل ہو گئی ——

(۲) فارسی ترکیبوں کو بہت کم استعمال کیا ——

(۳) محاورات کو اور اصلاحات کو اصول فصاحت سے جانچ کر استعمال کیا —— [1]

ناسخ کے مشہور شاگرد میر علی اوسط رشک کے متعلق نشتر کاکوروی لکھتے ہیں:-

زبان اردو پر اُن کا ہمیشہ احسان رہے گا کہ انھوں نے اُن الفاظ و محاورات و بندش کو نظم کیا جن کو متقدمین نے نہیں کیا تھا

چنانچہ فرماتے ہیں:-

وہ بندش وہ لفظیں ہیں پیرائی اے رشک　　شعر گوئی میں تمھیں سب سے جدا پاتے ہیں

اور صرف نظم کرنے ہی پر قناعت نہیں کی بلکہ اردو کا ایک لغت لکھا ہے جس کا تاریخی نام نفس اللغہ ہے جس کو تالیف کر کے اُردو کا بنیادی پتھر رکھا

رشک کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف اصلاحِ زبان کی غرض سے شعر کہا کرتے تھے [1]

[1] مقدمہ نفس اللغہ ص۳

دو شخصوں نے اپنے استادوں کی زبان کو ترک کیا اور لکھنؤ
کی ترکیب و بندش اور طریق کو اختیار کیا۔ ان میں اول اصغر علی
خاں نسیم شاگرد مومن دوم داغ شاگرد ذوق [1]
مولانا عبدالحیؒ مرحوم لکھتے ہیں۔
اصغر علی خاں نسیم پہلے شخص ہیں جنھوں نے اہل لکھنؤ کے
متروکات قبول کرنے میں پیش قدمی کی ہے [2]
ناسخ و آتش کے شاگردوں کے تلامذہ کا جب دور آیا تو وہ
بھی ناسخ ہی کے اصول پر زبان کی درستی کرتے رہے لکھنؤ کے
باکمال شاعر سید محمد مصطفٰے صاحب خورشید مرحوم نے افادات میں اپنے
متروکات کی جو فہرست لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں
نے بھی زبان کی اصلاح ناسخ ہی کے اصول پر کی ہے مثلاً بیار۔ بیاس
باالظہار یائے معروف۔ آخرش استظاری۔ رات و دن۔ و لیک
ولیکن نے باشباع بتلانا۔ یان۔ وان کو متروک قرار دیا ہے
نواب سید نیاد حسین جاہ مرحوم نے اپنے دیوان کے مقدمہ
میں جو اپنے متروکات لکھے ہیں ان سے بھی ناسخ کے اصول کی
پیروی ظاہر ہوتی ہے۔ جیسے میں نے سمجھا۔ ہر کہیں۔ خود رفتہ وغیرہ
کو متروک قرار دیا ہے۔ اور ان میں سے اکثر کی پیروی اہل دہلی نے
کی۔ اس طرح لکھنؤ اور دہلی کی زبان تقریباً ایک ہو گئی۔
دہلی کے مشہور انشا پرداز حضرت آزاد لکھتے ہیں:۔
اب جو زبان دہلی میں بولی جاتی ہے وہ گویا انھیں (اہل لکھنؤ)
کی ہے [3]

[1] تذکرہ جلوہ خضر اول ص۲۶۹ [2] گل رعنا ص[3] آب حیات

ان لوگوں نے زبان میں جو اصلاحیں کیں ان کی تقلید بھی دہلی والوں
کی مولانا آزاد شاگرد ابن ناسخ کے متعلق لکھتے ہیں:۔
ان لوگوں نے اور ان کے بعض ہمعصروں نے زبان کے باب
میں اکثر قیدیں واجب سمجھیں کہ دلی کے مستند لوگوں نے
بعض بعض باتوں کی رعایت اختیار کی ______
اصل واضع ان قوانین کے میر علی اوسط رشک تھے۔ چنانچہ
بعض الفاظ نمونے کے طور پر لکھنے ضروری ہیں ______
غدر سے پہلے دلی میں نہ بولتے تھے ______
اب دلی والے بھی یہی کہنے لگے [1]
مولانا عبدالحیؒ گل رعنا میں لکھتے ہیں:۔
زبان کی تراش خراش کر کے بدمزہ اور ناگوار الفاظ جو ان کے
زمانہ میں مروج تھے ترک کر دیے آگے بے جائیے ہے۔ ان
سب کو خلاف فصاحت قرار دیا۔ جس کو بالآخر دلی والوں کو
بھی ماننا پڑا [2]
نواب مرزا داغ مرحوم (جن کی زبان خاص قلعۂ معلی
کی زبان تھی) انھوں نے لکھنؤ کی تقلید میں بہت سی لفظیں ترک کر دیں
مولانا علی حیدر نظم طباطبائی نے شرح دیوان غالب میں کئی جگہ اس کا
ذکر کیا ہے۔ صفیر بلگرامی لکھتے ہیں:۔

[1] آب حیات ص۳۷۵
[2] گل رعنا ص

مولانا علی حیدر نظم طباطبائی تحریر فرماتے ہیں :-

جو لوگ دہلی کے فصحا و نقاد و مالک زبان و قلم ہیں اُن کا
کلام لکھنؤ کی زبان سے مطابقت رکھتا ہے۔ کس وجہ سے
کہ جب سے میر و سودا لکھنؤ میں آکر رہ پڑے اسی زمانہ سے
دلی گوش بر آواز لکھنؤ ہو گئی تھی۔ پھر انشاء اللہ خاں و جرأت
کے کلام نے ان کی توجہ کو ادھر سے پھرنے نہ دیا۔ بعد ان کے
آتش و ناسخ کے مشاعروں نے متوجہ کر لیا۔ بلکہ شاہ نصیر
و ذوق نے تو کلام کا رنگ ہی بدل دیا۔ آخر میں میر صاحب
کے مرثیوں نے خاص و عام سب کی زبان پر اثر ڈال دیا۔ اسی
زمانے میں نواب مرزا شوق کی تینوں مثنویاں گھر گھر پڑھی جانے
لگیں کہ لوگوں کو حفظ ہو گئیں۔ امانت بھی انہی دنوں میں اندر سبھا
کہہ کر اردو میں ڈرامے کے موجد ہوئے۔ اس کے علاوہ نامہ
قلق و اسوخت امانت اور شہروں کی طرح دلی کی گلیوں میں
بھی لوگ گاتے ہوئے پھرنے لگے۔ زبان کی شہرت کے
اسباب پر جب غور کیجیے تو یہی لوگ معلوم ہوتے ہیں جن
کے نام گزرے اور ان کے کلام کی شہرت نے اس زبان کو
مانوس کر دیا یہاں تک کہ دلی اور لکھنؤ کی زبان تقریباً
ایک ہو گئی —— مولوی محمد حسین آزاد لکھتے
ہیں۔ اب جو زبان دلی میں بولی جاتی ہے جس کو دلی کے تمام
امراء و شرفا اپنے ساتھ لے کر لکھنؤ میں آئے تھے اور دلی میں
گنتی کے ایسے لوگ رہ گئے تھے کہ جو صاحب زبان تھے ان کی

زبان پر غیر قوموں کی زبان نے تو کم مگر لہجے نے بہت اثر ڈالا
اور اس کی کسی کو خبر نہ ہوئی لیکن لکھنؤ میں وہ زبان سب
آفتوں سے محفوظ رہی ——
اسی سبب سے غالب دیکھیے میر مہدی کو فہمائش کر رہے ہیں کہ
دلی کی زبان کو لکھنؤ کی زبان پر ترجیح نہ دو ——
اس پر بھی بعض ناواقف کہہ اٹھتے ہیں کہ دلی کی زبان لکھنؤ
سے بہتر ہے۔ اس کلمہ سے جو لوگ باہر والے ہیں وہ دھوکا کھاتے
ہیں اور بہک جاتے ہیں۔ یہ علمی مسئلہ ہے اس میں انصاف و
راستی سے نہ گزرنا چاہیے [1]

علامہ طباطبائی فرماتے ہیں کہ لکھنؤ اور دہلی کی زبان تقریباً ایک
ہو گئی حضرت آزاد بھی گویا کی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا
کہ بالکل ایک نہیں ہوئی کچھ فرق رہ گیا۔ یہ فرق ناسخ کے وقت سے
[illegible] اور اسی سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ اس
(فرق) کی چند وجہیں ہیں :-

(۱) خود لکھنؤ کی قدیم (اودھی) کا اثر۔
(۲) اہل دہلی کی زبان پر ہمیشہ بھونڈی لفظیں۔ بھدی ترکیبیں چڑھی
رہیں جو لوگ دہلی کی زبان سے اپنا لسانی رشتہ جوڑے رہنا ضروری سمجھتے
ہیں وہ ان لفظوں کو وہ بدا کے بولتے ہیں۔ چاہے خود انہیں بری لگتی ہوں
[illegible] "ان کے ہاں" جیسے اہل لکھنؤ "ان کے یہاں" بولتے ہیں چند مثالیں

(۱) شرح دیوان غالب

اس کی آب حیات سے ملاحظہ ہوں :-

(الف) اہل دہلی کی رفاقت اور رواج کا رکا بیڑا اٹھایا ہوا تھا ص ۲۸۹
لکھنؤ میں بیڑا اٹھایا بولتے ہیں -

(ب) میر نجات کی گل کشتی ہم نے دیکھی ہوئی تھی ص ۱۵۵
لکھنؤ میں ہم نے دیکھی تھی کہتے ہیں -

(ج) چاندنی رات میں تلاؤ کے کنارے چاند کی بہار دیکھ رہے تھے ص ۲۸۰
لکھنؤ میں تالاب کہتے ہیں -

(د) ایک تازہ ایجاد ہوا ہے ص ۶۷
لکھنؤ میں ایجاد مونث ہے

(ہ) یہ میری اپنی ایجاد ہے ص ۲۹۲
لکھنؤ والوں کے نزدیک یہاں اپنی بے محل ہے -

ہم ان متفرق جملوں سے دہلی کی موجودہ زبان اور اس کے مقابل میں لکھنؤ کی زبان پیش کر کے ترجیح کا فیصلہ ذوق سلیم پر چھوڑتے ہیں -

دہلی کی زبان	لکھنؤ کی زبان
میں نے وہ کشتی جو میرا اپنا ایجاد ہے	میں نے وہ کشتی جو میری ایجاد ہے
ان کے ہاں تلاؤ میں دیکھی ہوئی تھی	ان کے یہاں تالاب میں دیکھی تھی

اس طرح کی اکثر ترکیبیں اور لفظیں پہلے کچھ لوگ بے خبری اور بے بصری سے بولتے رہے اب ضدم ضدا میں گندے بروزے سے خفک کھایا جاتا ہے لیکن صاحبان ذوق اور منصف مزاج اسے زبان کا عیب سمجھتے رہے - غالب کا یہ قول آپ سن چکے ہیں کہ :-

میرے کلام میں جو ناقص محاورے بندھ گئے ہیں - ان کو میں ناپسند کرتا ہوں مگر کیا کروں دلی کی زبان ہی ایسی ہے -

دہلی کے ایک انشا پرداز نے مرزا قادر بخش صابر کے دیوان کے مقدمہ میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ صابر نے غدر کے بعد آئے ہے، جائے ہے ترک کر دیا تھا اور جو لفظیں دہلی کی باقی رہ گیئں تھیں ان کے متعلق معذرت کی ہے کہ یہ فرق لکھنؤ اور دہلی کی زبان کا ہے جسے اہل لکھنؤ خیال نہ فرمائیں ان کی اصل عبارت یہ ہے :-

حضرت مرحوم نے غدر سے پہلے جو کچھ فرمایا تھا اس کلام میں بعض محاورات قدیم زبان کے باقی تھے مثلاً آئے ہے - جائے ہے وغیرہ لیکن اس دیوان میں کوئی محاورہ مخصوص بزبان قدیم نہیں ہے البتہ چند اصطلاحیں یا محاورے دہلی کے ایسے استعمال کئے گئے ہیں جو لکھنؤ میں نہیں بولتے یہ اختلاف لکھنؤ اور دہلی کی زبان کا ہے مثلاً ______ خاکسار یقین واثق ہے کہ اہل لکھنؤ اس اختلاف کو اختلاف نہ خیال فرمائیں گے۔

مرزا قادر بخش صابر دہلی کے شہزادے تھے اور اسی قلعہ معلی کی گود میں پلے تھے جس میں اردوئے معلی پروان چڑھی -

ایک نکتہ | یہ نکتہ بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اساتذہ لکھنؤ نے اپنے دیوان کے مقدموں میں اپنی اصلاح کا ذکر کیا ہے اور اساتذہ دہلی نے ان کے قبول کرنے کا - دہلی کا کوئی شاعر ایسا نہیں جس نے یہ لکھا ہو کہ میری یہ متروکات اور اصلاحات ہیں - اسی سے لکھنؤ اور دہلی کا فرق ظاہر ہے -

(۳) غالب کے زمانہ میں ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ناسخ کی اصلاحیں عا
نہ ہوئی تھیں جس سے پوری تقلید کی جاسکتی چنانچہ غالب کہتے ہیں:

ناسخ نے جن قاعدوں سے زبان کو درست کیا تھا جس
کے سبب سے تمام لکھنؤ کی زبان ایک ہو گئی وہ قاعدے
عام نہیں ہوئے کہ ہم تک پہونچتے ———
یاد رہے کہ زبان لکھنؤ کی مستند ہے

(۴) ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ لکھنؤ میں ناسخ نے تقریری زبان کو ا
درست کیا کہ تمام ناتراشیدہ لفظیں اور ترکیبیں دور ہو کے زبان ا
بن گئی اور دہلی میں تقریری زبان اتنی ترقی نہ کر سکی بہت سی بھو
لفظیں زبان پر چڑھی رہیں جو بے اختیار صرف ہوتی رہیں۔ صفیر بلگ
لکھتے ہیں:۔

ہر مقام کی زبان تقریری اور تحریری علیحدہ علیحدہ ہوتی
ہے۔ مگر ناسخ نے جب اردو زبان کی اصلاح کی تو اصول یہ قائم
کیا کہ زبان تقریری کو ایسا درست کرو کہ تحریری بھی ویسا
ہی لکھو یعنی تقریر اور تحریر میں کچھ فرق نہ ہو۔ اس کا فائدہ یہ
ہے کہ زبان کی درستی کا خیال رہے گا اور محاورات صحیح یاد
رہیں گے اور سب کی سمجھ میں مطلب یکساں آئیں گے چنانچہ
لکھنؤ کے خواص و عوام کی زبان یکساں ہے اور بندش فقرات
کی جاہل و عالم میں یکساں ہے ——— لکھنؤ کے عوام الناس
کی زبان شعراء کی ترکیب و بندش سے ملا کے دیکھ لو ———
بخلاف دہلی کے تقریر و تحریر عوام و خواص ———

کا فرق تو جیسا ہے ویسا ہے شعراء کا اختلاف ایسا نظر آیا کہ
قواعد و محاورات جو کتابوں میں لکھے ہیں وہ بہت صحیح اور
درست لکھے ہیں اور شعر میں ان قواعد کو مستعمل نہیں کرتے۔
تذکرہ جلوہ خضر جلد اول صفحہ ۲۷

میرا خیال ہے کہ ہر جگہ کے لوگوں نے تحریر میں لکھنؤ کی زبان اختیار
کی لہٰذا اس میں ایک حد تک یکسانی پیدا ہو گئی اور تقریری زبان کو
بھی ترتیب میں بالکل لکھنؤ کے مطابق کر لیا کیونکہ مطلب کا صاف
صاف ادا ہونا اس کے اختیار پر مجبور کرتا تھا۔ اس طرح ہر جگہ کی زبان کو
لکھنؤ کی زبان نے متاثر کر کے اپنا مقلد بنا لیا۔ لیکن بہت سی مقامی
لفظیں اور محاورے ہر جگہ کی تقریری زبان میں رہ گئے۔ حضرت انشاء
اللہ لکھتے ہیں:۔

ہر شہر را زبانے است مخصوص بآں شہر ہر کس کہ داں جا
متولد می شود بزبان شہر حرف می زند ؎

چنانچہ باہر کے مہذب اور متمدن افراد۔ شعراء اور ادباء بھی بے تکلف
بول چال میں اپنی مقامی لفظیں اور پر تکلف صحبتوں میں لکھنؤ کی زبان
بولتے ہیں۔ اس دو رنگی کا اثر ان کی تحریر میں بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔
یہی سبب ہے کہ صاحبان علم و فضل اپنے کو اہل زبان نہیں کہتے بلکہ
لکھنؤ کا متبع سمجھتے اور اسی پر فخر کرتے ہیں۔ کیونکہ انھوں نے زبان سیکھنے
میں عمر گزارنے کے بعد اپنی کوشش سے اس میں کمال حاصل کیا ہاں اگر

؎

کوئی لکھنؤ ہی کا روڑا بن جائے تو شاید اہل زبان کا درجہ حاصل ہوجائے
انشاء اللہ خاں لکھتے ہیں کہ اہل زبان بننے کے لئے چار شرطیں ضروری
ہیں :-

(۱) ماں باپ اہل زبان ہوں
(۲) اہل زبان کی صحبت میں رہے۔
(۳) تحصیل و تحقیق زبان میں مشغول رہے۔
(۴) آدمی پرکھنے والا اور ذہین ہو۔

ان میں سے آخری تین شرطیں ضروری قرار دی ہیں
(۵) اس کے علاوہ لہجہ اور حسن تکلم ہے جس کی تقلید سے دہلی والے
مجبور تھے۔ یہ چیز بھی دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں امتیاز قائم کیے رہی
انشاء اللہ کا قول آپ سن چکے ہیں کہ اردو سے تنہا الفاظ مراد
نہیں لہجہ بھی شریک ہے جو اُردو کی اصالت ہے۔ معلوم ہوا کہ
زبان کے ساتھ لہجہ بھی ہوتا ہے۔ الفاظ تو بولے جا سکتے ہیں مگر لہجہ
نہیں آ سکتا۔ اس لئے لکھنؤ کی تقلید کرنے کے بعد بھی وہاں کی برابری
ممکن نہیں۔

انشاء اللہ خاں نے لکھنؤ کی زبان کو دہلی کی زبان پر جب
اس کی اصلاح لکھنؤ والوں نے نہیں کی تھی اسی بنا پر ترجیح دی ہے
وہ کہتے ہیں کہ نزاکت صدا اور حسن تکلم وغیرہ جو ان کی ایجاد ہے –
اس سے ان کی برتری اہل دہلی پر واضح ہے مختصر کہ یہ لوگ اہل دہلی
سے فصیح و بلیغ تر ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصلاح
سے پہلے لکھنؤ والوں کا لہجہ اُردو کے لئے موزوں تر سمجھا جاتا

تھا۔ انھیں وجوہ سے مولانا امداد امام اثر کہتے ہیں:-
ہم لوگوں کا بڑا کمال یہ ہے کہ زباندان کہلائیں۔ اہل زبان
ہونا تو تمام تر خارج از امکان ہے۔ [۱]
یہ ہیں وہ حقیقتیں جن کی موجودگی میں دہلی کی زبان کو لکھنؤ کی
زبان پر ترجیح دینا عقل صحیح اور ذوق سلیم کے لئے ممکن نہیں۔

---

[۱] کاشف الحقائق ص ۱

کمال کا زور دیکھیے کہ ولی ایک نئی چیز لائے مگر دہلی والوں نے اس کے
حاصل کرنے میں ان کی شاگردی نہیں کی بلکہ استاد بن گئے۔ شاعری کے
گر سکھائے۔ اپنی زبان سکھائی۔ فارسی شاعری کی تقلید کرائی اور
اب وہ ایک لچر سی چیز نہیں رہ گئی۔ بلکہ اس کا ایک ایسا ڈھانچا بن
گیا جس میں تربیت قبول کرنے کی صلاحیتیں کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی
تھیں۔ اس طرح دہلی میں اردو شاعری کی بنیاد پڑی۔

ملا عبد الواسع ہانسوی غرائب اللغات کے نام سے اردو کی
ایک لغت مرتب کر چکے تھے۔ اب زبان کی تدوین کا خیال ہوا تو
سراج الدین علیخاں آرزو نے اسی غرائب اللغات پر نظر ثانی کر کے
بہت سی لفظیں بڑھائیں غلطیوں کو صحیح کیا اور نوادر الالفاظ نام
رکھا۔ جب اور لوگوں کو بھی اس زبان میں شعر گوئی کا شوق ہوا تو
انھیں ارباب کمال کی طرف رجوع کی۔ خان آرزو نے سب سے زیادہ
لوگوں کی

مشاعرے کی ایجاد

انھوں نے شعراء کی تربیت بھی کی اور مشاعرے
ایجاد کی جس سے ایک نئی چہل پہل پیدا ہو گئی اور شعراء کے کلام پر
اصلاح دی اس طرح وہ سب کا مرجع بن گئے۔

میر تقی میر لکھتے ہیں :-

ہمہ استادان مقبول فن ریختہ شاگردان بزرگوار اند [1]

سپہر شاعری کے بدر منیر میر حسن فرماتے ہیں

استادان ریختہ نیز شاگرد او یند [2]

---

[1] نکات الشعراء

تیسرا باب

لکھنؤ کی زبان تاریخ کی روشنی میں

تازہ خواہی داشتن گر داغ‌ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

ہاں اے دل عبرت بیں از دیدہ نظر کن ہاں

مغل اعظم کے جاہ و جلال کا آفتاب نصف النہار پر ہے اور
راجگان ہند کی حشمت کی یادگار دہلی آل تیمور کی عظمت کی سرمایہ دار
ارباب کمال کا قبلہ۔ اہل ہنر کا کعبہ۔ تمدن کا سرچشمہ تہذیب کا
گہوارہ۔ عیش کا گھر۔ دولت کا مستقر بنی ہوئی ہے۔ کوئی
جوہر کہیں پیدا ہو مگر یہیں آ کے چمکتا ہے اور کوئی گوہر کہیں نکلے مگر
یہیں آ کے دمکتا ہے۔ ولی کو بھی اسی ام البلاد کی کشش کھینچ کر
لاتی ہے۔ اور اردو شاعری جو

اک چیز لچر سی زبان دکنی تھی

ان کے ساتھ آتی ہے۔ اس وقت یہاں فارسی گو شعراء میں مرزا محمد
موسوی خاں فطرت، مرزا عبد الغنی قبول۔ مرزا عبد القادر بیدل،
قزلباش خاں امید۔ سلیمان قلی خاں وداد۔ مرتضی قلی خاں فراق
علی قلی خاں ندیم، سراج الدین علی خاں آرزو۔ میر شمس الدین فقیر
شیخ سعد اللہ گلشن ایسے صاحبان فضل و کمال کا مجمع ہے۔ اس
جدید چیز میں جو اگرچہ لچر سی تھی مگر کچھ ایسا مزہ تھا کہ
سب اسکی طرف جھک پڑے اور اس میں بھی شعر کہنا شروع کیا

تذکرہ ریختہ گویاں کے مؤلف سید فتح علی حسینی گردیزی لکھتے ہیں :-

میاں آبرو میاں مضمون کہ بنائے ریختہ ایشاں ریختہ اند -
استنباط سخن با و دارند و بزبان ریختہ ازو گرفتہ اند[1]

طبقات الشعراء کے مؤلف مرزا قدرت اللہ شوق لکھتے ہیں :-

اکثر وستادان فارسی و ریختہ تلامذہ او یند[2]

کشت اردو کو آب حیات سے سینچنے والے حضرت آزاد تحریر فرماتے ہیں :-

خان آرزو کو اردو پر وہی دعویٰ پہنچتا ہے جو ارسطو کو فلسفہ
اور منطق پر ہے جب تک کل منطقی ارسطو کے عیال کہلائیں گے
تب تک اہل اردو خان آرزو کے عیال کہلائیں گے[3]

تاریخ و تحقیق زبان کے خضر طریقت صفیر بلگرامی کہتے ہیں :-

اس وقت کے جتنے شعراء تھے سب ان کو اپنی غزل
دکھاتے تھے[4]

اس زمانہ (دور اول) کے مشہور شعراء یہ ہیں :-
شاہ مبارک آبرو - شیخ شرف الدین مضمون - شاہ ظہور الدین حاتم
محمد شاکر ناجی - مصطفیٰ قلی خاں یکرنگ، اشرف علی خاں فغاں -
ان لوگوں کی شاعری کوئی اعتبار کا درجہ نہیں رکھتی - بقول مصنف
شعر الہند :-

مبتذل اور مکروہ الفاظ کا مجموعہ ہے

[1] تذکرہ ریختہ گویان
[2] طبقات الشعراء
[3] آب حیات
[4] جلوہ خضر

ان کا ذکر سلسلہ تاریخ کی کڑیاں جوڑنے کے لئے کر لیا جاتا ہے زبان
[illegible] اصلاح میں بھی ان کا کوئی حصہ نہیں یہ وہ شعراء تھے جن سے دہلی میں
[illegible] کی صبح ہوتی - اس وقت اورنگزیب عہد کی شام ہو چکی تھی جس
[illegible] بڑی اتنی کہ گیارہ سال چودہ دن گزر گئے - اور کڑی اتنی
[illegible] بادشاہوں کے جنازے نکل گئے - اس کے بعد اگرچہ محمد شاہی
[illegible] کا آفتاب اپنی پوری آب و تاب سے نکلا مگر کچھ ہی بلند ہوا تھا
[illegible] شاہ درانی گھٹا کی طرح اٹھ کر ساری دلی پر چھا گیا اور تین
[illegible] تلواروں کی بجلیاں چمکتی رہیں اور سروں کی بارش ہوتی رہی
اس طرح شاعری کے آغاز ہی سے دلی کے اطمینان کا خاتمہ
[illegible] شاعری تو ہمیشہ بزم کو ڈھونڈتی ہے اور دہلی اب رزم گاہ
[illegible] تھی - لہذا اس نے بھی اپنا اسباب سفر باندھا -
نواب سید محمد امین مخاطب بہ سعادت خان برہان الملک بہادر
[illegible] کو اودھ کا صوبہ مل چکا تھا - وہ شرفاء اور سرداران فوج جو
[illegible] مالک تھے اودھ میں آنا شروع ہو گئے تھے - دہلی کی حالت
[illegible] ہوتی جاتی تھی اتنے قافلے کے قافلے لکھنؤ کی طرف جاتے
[illegible] تھے - نادر کے دن کی لوٹ مار اس پر دربار کی بدنظمی اور
[illegible] دان جوہر کی بے قدری نے لوگوں پر اس سرزمین کو اتنا تنگ کر دیا کہ
[illegible] کا ایک سیلاب لکھنؤ کی طرف بہ نکلا - یہاں تک کہ
[illegible] الدین علیخاں آرزو جو اردو شاعری کا سرچشمہ تھے دہلی چھوڑ کر
[illegible] گئے اور اشرف علی خاں فغاں کے سے ارکان دولت کا
[illegible] کا زمانہ رہا -
محمد شاہ کے بعد شاہ عالم اول اور عالمگیر ثانی کا زمانہ آیا

یہ دونوں عہد بارہ سال میں ختم ہو گئے۔ اس مدت میں مرہٹوں کا سیلاب اس زور سے آیا کہ مغل اعظم کے جاہ و جلال کا سفینہ ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا۔ وہ قلعہ معلیٰ جس کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھنے سے رستم و اسفندیار کا پتا پانی ہوتا تھا۔ مرہٹوں کی گھوڑ دوڑ کا میدان بن گیا اور وہ دیوان عام جس میں باریانے والا نقیب کے "بادب نگاہ روبرو" کہتے ہی تھرا جاتا تھا۔ خرام نے بے ادبانہ کی جولانگاہ بن گیا۔ وہ سقف طلا جس کے نیچے آل تیمور کی عظمت و جلال کا آفتاب چمکتا تھا۔ مرہٹوں کی دست برد کی نذر ہو گئی۔

سکھوں کی پشمینہ بر دوش جماعت زرہ پوش ہو کے مرد میدان بن گئی۔

تیس ہزار پنڈاریوں نے خلیج بنگال تک قتل و غارت کا طوفان برپا کر دیا۔

سورج مل جاٹ بھرتپوری نے امیروں کی جاگیروں کو دبا لیا غلام قادر خاں روہیلہ نے قلعہ معلیٰ پر قبضہ کر کے شاہ عالم کو قید کر لیا اور سینہ پر چڑھ کے ان کی آنکھیں نکال لیں۔ شہزادوں اور امیرزادوں کو اشارکر نے ننگوا دیا اور رشتوں کی گڑی ہوئی دولت قبولوا کے تہ خانے اور چھتیں کھدوا کے نکال لی۔ [1]

آخر شاہنشاہ ہندوستان نے اپنی کمزوری، مرہٹوں کی شوری سکھوں کی سینہ زوری اور نوکروں کی حرامخوری سے بے بس ہو کے انگریزوں کے دامن میں پناہ لی اور سلطنت دیکے پندرہ لاکھ سالانہ

---

[1] (وقائع شاہ عالم قلمی)

۔۔۔ گذارہ پر قناعت کر کے گوشہ نشین ہو گئے۔ اس زمانے کی حالت ۔۔۔ ذکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل دہلی پر وہاں کی زمین تنگ ہو گئی تھی۔ ۔۔۔ سودا کا تضحیک روزگار اور شہر آشوب پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے ۔۔۔ قدیمی امیرزادے نان شبینہ کو محتاج ہو گئے تھے۔ انشاء اللہ خاں کا بیان ہے کہ:۔

شاہجہاں آبادیاں اور شہر خود بیشتر محتاج بنان شبینہ و کمتر نان می خورند [1]

مثل مشہور ہو گئی تھی سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم"

"شاہ عالم ثانی نہ جو لھبے پر توا نہ گھڑے میں پانی"

اس عالم میں متوسطین کا دور شروع ہوا جس مملکت میں ۔۔۔ قدیمی امیرزادے فاقہ کر رہے ہوں، وہاں علوم و فنون کی قدر اور ۔۔۔ شاعری کی سرپرستی کون کرے۔ سب کے دل اچاٹ ہو گئے۔ مگر جائیں کہاں؟ چاروں طرف چھائے ہوئے اندھیرے میں سامنے اودھ کا دربار صبح کے ستارے کی طرح چمک رہا تھا اور غربت زدہ مسافروں کے لئے منارۂ روشنی بنا ہوا تھا۔ برگشتہ قسمت دہلی کا لٹا ہوا کاروان اس اندھیرے میں اس روشنی کا سہارا پاتے ہی لکھنؤ کی طرف چل کھڑا ہوا۔ اس طرح دہلی کی برسوں کی کمائی ایک دم سے لکھنؤ کے ہاتھ آ گئی۔

منشی احمد علی صاحب بی اے تحریر فرماتے ہیں:۔

خاندان تیموریہ کی روز افزوں تباہی اور اسلامی سلطنت

---

[1] دریائے لطافت

کے ضعف کے باعث پایۂ تخت ویران ہو رہا تھا۔ پرانے
پرانے خاندان مٹنے لگے۔ اور وہ لوگ جو بزرگوں کی
سفت ہزاری اور صوبہ داری کے جاہ و حشم میں ناز و نعم سے
پلے تھے۔ شکستہ حال اور فاقہ کش ہو ہو کے خانہ خراب
ہو رہے تھے لیکن دہلی سے نکلیں تو جائیں کہاں؟ ہر طرف آگ
لگی ہوئی تھی کہیں امن نہ تھا۔ ملک کی یہ حالت ہو رہی تھی
کہ ایک طرف مرہٹے سر اٹھائے ہوئے ہیں۔ ان کے گھوڑوں
کے ٹاپوں سے ادھر راجپوتانہ ادھر مالوہ بندیلکھنڈ اور
گجرات میں بل چل مچی ہوئی ہے۔ لڑتے بھڑتے لوٹتے مارتے
گاؤں کو ویران کرتے ابھی ادھر سے نکل گئے ابھی ادھر
سے سارا ملک تہ و بالا ہو رہا ہے کہیں چین نہیں دوسری طرف
پنجاب میں سکھا شاہی کے جور و جفا سے خلقت جاں بلب
ہو رہی ہے۔ تعصبات مذہبی کے شعلے آسائش عامہ کے
لئے برق خرمن سوز کا کام کر رہے تھے۔ چین سے پاؤں پھیلا کے
سونا تو کجا جان و مال عزت و آبرو کی خیر ہر شخص خیر منا رہا
تھا۔ ایک طرف ٹیپو سلطان کی چنچلی طبیعت اور فرانسیسیوں
کے سیف و قلم کی دھاک بندھی ہوئی تھی۔ جدال و قتال
صف آرائی اور میدان داری کا بازار گرم ہے۔ دوسری
طرف پنڈاریوں کی لوٹ مار سے بستیاں اجاڑ اور راستے
مخدوش ہیں ایسی مصیبت تباہی بے امنی اور جاں بلبی
کے وقت جو کچھ سکون و قرار راحت و اطمینان کا سامان
نظر آتا تھا تو اودھ کے چھوٹے سے ٹکڑے میں پھر

کی فیاضی اور سیر چشمی کا غلغلہ بھی بلند ہو چکا تھا۔ ہندوستان کے ہر
گوشہ و زاویہ سے جو زمانہ کا ستایا ہوا اور وقت کا مارا ہوا نکلتا
اودھ ہی طرف جھکتا ہے(۱)

رام بابو صاحب سکسینہ لکھتے ہیں:-

اس عام بدامنی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اپنا وطن چھوڑ کر بھاگنے
لگے وہ شاعر جو کہ سلطنت کے دامن دولت سے وابستہ
تھے۔ مثلاً میر۔ سودا۔ میر حسن۔ انشاء۔ وغیرہ انھوں نے
بھی دلی چھوڑ کر لکھنؤ کا رخ کیا جو اس وقت ان کا قدر
شناس اور ان کے واسطے دولت خیز خطہ تھا اور علم کی
قدر دانی میں دربار دہلی کے قدم بقدم چلنا چاہتا تھا۔ اس
طور پر دلی کا نقصان لکھنؤ کا نفع ثابت ہوا شعرائے دہلی
کو اہل لکھنؤ نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے ساتھ نہایت
اخلاق و محبت سے پیش آئے سلطنت کی طرف سے ان
کے واسطے جاگیریں۔ وظائف۔ انعام و اکرام مرحمت
ہوئے۔ نازک مزاجیاں اور بد دماغیاں تک بہت
کشادہ پیشانی سے برداشت کی جاتی تھیں بلکہ اکثر انھیں
اوصاف کی تعریف کی جاتی تھی۔ سلسلہ روابط کو اور
مضبوط کرنے کے لئے نوابان عہد اور امرائے وقت نے اکثر
شعراء کو اپنے دامن دولت سے وابستہ کر لیا اور ان کو اپنا
رفیق و صاحب بنا لیا ہے(۲)

---

(۱) دلی اور اودھ۔ (۲) تاریخ ادب اردو صفحہ ۲۵۵

اس قدر دانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس شخص میں کسی طرح کا کوئی بھی جوہر موجود تھا وہ دہلی چھوڑ کر لکھنؤ چلا آیا۔ مولانا عبدالحلیم شرر اپنی کتاب گزشتہ لکھنؤ میں لکھتے ہیں :۔

دہلی کی سبھا وہاں سے اکھڑ کے لکھنؤ میں جم رہی تھی اور لکھنؤ میں ایک جوش قدردانی تھا جس سے ہندوستان کی تاریخ خالی ہے[۱]

اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

اس دور کی مہذب ترین سوسائٹی کے جتنے مشہور اور نامور بزرگ تھے سب لکھنؤ کے اندر جمع تھے[۲]

منشی احمد علی صاحب بی اے تحریر فرماتے ہیں :۔

شریف اور خاندانی امیرزادے۔ سپاہی منش اور تلوار کے دھنی سورما۔ ہر علم کے عالم ماہر اور ہر فن کے کامل سبھی رنگ اور سبھی مذاق کے لوگ آنے اور جوہر شناس رئیس اور اس کے قدردان درباریوں کی داد و دہش اور بذل و ایثار سے یہیں رہ جانے لگے[۳]

یہ اُن لوگوں کے بیانات ہیں جنھوں نے کتابوں میں پڑھ کے حالات معلوم کئے ہیں۔ اب ہم آپ کو اسی زمانے کے مشہور شاعر حضرت انشاء کی زبان سے اس وقت کی آنکھوں دیکھی حالت سناتے ہیں :۔

(۱) کثرت دہلویان فصیح دریں شہر بدرجہ است کہ حصر امکان ندارد[۴]

---

۱ گزشتہ لکھنؤ صفحہ ۴۴ ۲ گزشتہ لکھنؤ ص ۴۴ ۳ مرقع ادب ص ۳۱ ۴ دریائے لطافت ص ۳۶ ۵ دریائے لطافت ص ۶۸

(۲) ہر قدر کہ زن و مرد صاحب سلیقہ شاہجہاں آباد در لکھنؤ آمدہ اند در شاہ جہاں آباد نماندہ اند ___

[illegible] سپاہی و مصاحب پیشہ و لطیفہ گو و بذلہ سنج و مطرب و [illegible] خوان دریں شہر ہمہ از دہلی آمدہ اند[۵]

[illegible] نوبت پہنچی کہ شاہی خاندان کے افراد بھی لکھنؤ آکر آباد ہونے لگے۔ گل رعنا کا مصنف لکھتا ہے:

[illegible] جہاں بخت شاہ عالم بادشاہ کے ولی عہد لکھنؤ آئے۔ یہ کچھ دنوں رہ کر بنارس چلے گئے [illegible] مرزا سلیمان شکوہ آئے۔ وہ یہیں رہ پڑے[۶]

ان تاریخی اور چشم دید بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دہلی [illegible] کے اوراق مصور تھے صفحہ سادہ بن گئی۔ ہر طرح کے اہل [illegible] سواد سے نکل کے لکھنؤ چلے آئے اور وہ شاہجہاں آباد [illegible] یہاں ان مشہور شاعروں کے نام لکھے جاتے ہیں جو دہلی چھوڑ [illegible] آئے

[illegible] الدین علی خاں آرزو ــ	(۲) حکیم شفائی خاں ارشد
[illegible] علی خاں فغاں	(۴) زبردست خاں وفائی
[illegible] تقی میر	(۶) مرزا رفیع سودا
[illegible] الدین ضیا	(۸) شیخ عبدالرضا متین
[illegible] امامی	(۱۰) صلاح الدین عرف میر مکھن پاکباز
[illegible] اعلیٰ	(۱۲) سلام اللہ خاں تسلیم
[illegible] علی خاں اشرف	(۱۴) میر سید محمد سوز

[illegible] دریائے لطافت ص ۷۱

[illegible] گل رعنا ص ۳۸۳

(۱۵) شیخ قیام الدین قائم (۱۶) رائے سروپ سنگھ دیوا[illegible]
(۱۷) خواجہ حسین علیخاں، دخش (۱۸) مرزا محمد علی شہرت
(۱۹) نظر علی خاں گمان (۲۰) منشی کشن چند مجرد
(۲۱) شاہ مجنون مجنون (۲۲) میر ولایت اللہ ولایت
(۲۳) شاہ واقف واقف (۲۴) محمد حیات بیتاب
(۲۵) میر حیدر علی حیران (۲۶) مرزا اسماعیل تپش
(۲۷) میر محمد حسن حسن (۲۸) بقاء اللہ خاں بقا
(۲۹) میر ولی اللہ محب (۳۰) مرزا فاخر مکین
(۳۱) میر شمس الدین فقیر (۳۲) نصیر الدین نصیر
(۳۳) مرزا بر علی بیگ قاصر (۳۴) مرزا احسن علی احسن
(۳۵) میر منظر علی زار (۳۶) شیخ عبدالرحیم [illegible]
(۳۷) میر قدرت اللہ رخصت۔ (۳۸) میر غلام حسین فنا[illegible]
(۳۹) میر غلام حسن حسن (۴۰) میر مستحسن خلیق
(۴۱) مرزا جعفر علی حسرت (۴۲) میر قمر الدین منت
(۴۳) میر نظام الدین ممنون (۴۴) شیخ قلندر بخش جرأت
(۴۵) میر محمد علی راقم (۴۶) میاں عبدالرحیم ز[illegible]
(۴۷) میر محمد یعقوب عیاش (۴۸) شیخ محمد حسن محسن
(۴۹) میر حسن مشتاق (۵۰) میر محمد علی وہم
(۵۱) حسن علی خاں یاس (۵۲) محمد عوض راز
(۵۳) میر حفیظ اللہ حفیظ (۵۴) خواجہ حسن حسن
(۵۵) میر غلام حسین برشتہ (۵۶) میر انشاء اللہ خاں انشا
(۵۷) میر شیر علی افسوس (۵۸) رضی الدین سروری

(۵۹) مرزا اشرف الدین وفا (۶۰) مرزا ابو علی ہاتف
(۶۱) شیخ غلام ہمدانی مصحفی (۶۲) مرزا سعادت یار خاں۔ رنگین۔
(۶۳) محمد حسن قتیل (۶۴) مرزا کاظم علی جوان

مولوی عبدالسلام ندوی تحریر فرماتے ہیں:۔

(۱) "انھوں نے (آصف الدولہ) نہایت فراخ حوصلگی کے ساتھ شعراء کی قدردانی کی اور اُن کی بیش قرار تنخواہیں مقرر کیں۔ اس لئے اب دلی کے بجائے لکھنؤ شاعری کا مرکز بن گیا۔

(۲) عام طور پر منتخب اور برگزیدہ لوگوں نے لکھنؤ کا رخ کیا اور اس طرح دلی نے قالب بدل کر گویا دوسرا جنم لیا اور شاعرانہ حیثیت سے جو مرکزیت اس کو حاصل تھی وہ لکھنؤ کو بھی حاصل ہوگئی" [۱]

یہاں چند باتیں ذہن نشین کرکے آگے بڑھنا چاہیئے۔

(۱) دہلی سے لکھنؤ آنے کا خیال اسی کو ہوتا تھا جس کا کمال دہلی میں مسلم ہوچکتا تھا۔ یہ لوگ ایسے ہی صاحبان فضل و کمال تھے جن کا کلام لوگ دہلی سے تحفہ کے طور پر لے جاتے تھے۔

(۲) اس زمانہ میں دہلی شاعروں سے خالی ہوگئی۔ لکھنؤ سے آیا ہوا کلام محفلوں کو گرماتا تھا۔ اس طرح لکھنؤ سے دہلی متاثر ہورہی تھی

(۳) اس دور (متوسطین) کے شاعروں نے زبان کی اصلاح کا پہلا قدم اٹھایا اور وہ سب دہلی چھوڑ کے لکھنؤ آچکے تھے۔

---

[۱] شعر الہند [۲] شعر الہند جلد اول ص[illegible]

لہٰذا دہلی کی زبان میں جو کچھ اصلاح ہوئی وہ لکھنؤ میں اور اس کو قبول کرنے میں دہلی والوں کو تامل نہ ہوا کیونکہ اصلاح کرنے والے دہلوی تھے اور ان کے کمال کا سکہ دہلی میں بیٹھ چکا تھا۔

اس وجہ سے دلّی والوں سے ایک طرف تو اصلاح زبان کا مادہ سلب ہو رہا تھا دوسری طرف وہ اس کے عادی ہو رہے تھے کہ لکھنؤ میں جو اصلاحیں ہوں اُن کو قبول کر کے اپنی زبان درست کریں اس طرح وہ لکھنؤ کی تقلید کے عادی ہوتے گئے۔

(۴) اصلاح زبان کی صلاحیت لکھنؤ میں نشو و نما پا رہی تھی اور اہل لکھنؤ میں یہ استعداد بڑھ رہی تھی۔ جب زمانہ نے دہلی والوں کی جگہ خالی کی تو لکھنؤ والے ان کی جگہ پر آ گئے اور زبان کے مالک بن گئے۔

یہ دور دلی کے بھی سنبھالے کا زمانہ کہا جاتا ہے یعنی اس زمانہ کے شعراء دہلی ہی میں رہے۔ مگر انہوں نے ایسی فضا میں آنکھ کھولی تھی جس پر لکھنؤ کی تقلید چھائی ہوئی تھی اور ان کی جبلت بن چکی تھی اس لئے سب نے آنکھ بند کر کے بے ارادہ لکھنؤ کی تقلید کی۔ مرزا غالب کا یہ قول آپ سُن چکے ہیں کہ ناسخ کے کلام نے دلی میں سب کو حیران کر دیا اور سب اس پر گر پڑے۔

(۵) ان لوگوں کے بعد داغ نے شہرت حاصل کی وہ لکھنؤ کے مقلد تھے ان کے بعد دہلی میں شاعری کا چراغ بجھ گیا۔ اور لکھنؤ میں جب سے اب تک ہر صنف سخن کے باکمال شاعروں کا جمگھٹا رہا ہے اور جب تک یہ خصوصیتیں اس کو حاصل رہیں گی اس وقت تک وہ زبان کا مرکز رہے گا جس پر کسی کے ماننے یا نہ ماننے کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

چوتھا باب

لکھنؤ کی زبان پر اعتراضات

اور

ان کا جواب

وہ کھٹکتے ہیں جو ہیں منصف مزاج و نکتہ رس — ہے زبان گلستان لکھنؤ بے خار و خس

(صفی)

پہلا اعتراض اور اس کا جواب

لکھنؤ کی زبان پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان میں پہلا اعتراض یہ ہے کہ جب سے لکھنؤ نے تہذیب و تمدن اور زبان و شاعری میں دہلی کی تقلید چھوڑ کے اپنا معیار الگ قائم کیا اس وقت سے وہاں کے تمدن میں زنانہ پن آ گیا جس سے زبان و شاعری میں نسائیت پیدا ہو گئی۔

اس اعتراض کے جواب میں پہلے دہلی اور لکھنؤ کے سیاسی اور اقتصادی حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے جس پر تہذیب و تمدن کی بنیادیں قائم ہیں۔

سیاسی انقلاب اور دہلی کا تمدن

گزشتہ باب میں یہ عبرت خیز داستان آپ سن چکے ہیں کہ دہلی میں شاعری شروع ہوتے ہی قتل و غارت کے ایسے سخت زلزلے آئے کہ اس کی تاریخی آن بان اور شوکت و شان کی فلک بوس عمارت زمین کے برابر ہو گئی۔

ناز و نعم کی گود میں پل کر جوان ہونے والے پوتڑوں کے رئیس روٹیوں کو محتاج ہو گئے۔ آج درانیوں نے لوٹا تو کل پنڈاریوں نے، پرسوں روہیلوں نے تاراج کیا تو نرسوں بندیلوں نے کبھی سکھوں نے تاخت کی کبھی مرہٹوں نے۔

غرض ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی جنگ جو قوم ایسی نہ تھی جو گھوڑے دہلی میں نہ دوڑا کرتے ہوں۔ اس سے ایک بھگدڑ مچی ہوئی تھی اور لوگ فیض آباد کی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے۔

ارباب نشاط اور شاہدان حسن کا گروہ جو امن و اطمینان اور دولت و ثروت کا بندہ ہے وہاں کب ٹک سکتا تھا۔ سب نے اُدھر کا رخ کیا اور دہلی سے زندہ دلی عیش و طرب اور عشق و عاشقی رخصت ہو گئی۔ پژمردگی اور افسردہ دلی ہر طرف چھا گئی لیکن انسان کسی حالت میں ہو فطری میلانات ضرور غالب آتے ہیں۔ ان حالات میں امرد پرستی شروع ہوئی اور اس قدر عام ہو گئی کہ اس کے اظہار میں عیب نہ رہا۔ میر ایسے برگزیدہ شخص نے بھی پرسرام کے عشق کا قصہ لکھ ڈالا۔

میر غفر غبنی کی وہ مشہور گفتگو جس میں انھوں نے شعرا پر تنقید کی ہے اس میں میاں انشا کو یہی طعنہ دیا ہے۔

آگے پغزاد (پریزاد) تھے۔ ہم بھی گھوغنے (گھورنے)
جاتے تھے اب "شائغ" (شاعر) بن گئے ہیں[1]

ذرا اس اخلاقی پستی کو دیکھیے کہ انشاء کو طعنہ تو دے رہے ہیں لیکن اپنی دلبستگی کا اظہار کس بلند آہنگی سے ہے اور لطف یہ کہ اس کے ناقل خود میاں انشاء ہیں۔

---

[1] دریائے لطافت

مصحفی نے اپنے تذکرہ میں فدوی پر یہی الزام لگایا ہے۔

"قدم در راہ امرد پرستی می گزاشت چند جا خانہ جنگی ہم کردہ بود کان حسین تعشق درزیدہ"۔

میر حسن کے تذکرے میں ایسے بہت سے پاکبازوں کا ذکر موجود ہے۔

صلاح الدین پاکباز

"بر سوہنا دمکھن کہ قوال بچہ بود نظر الفتے می داست"۔

میر احمد یار کے حالات میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اس بدعادت کے عام ہونے کا اندازہ کیجیے:۔

"جوانے بود با کمال وجاہت کہ یوسف ثانی تواں گفت۔

دوران زمان عالم عالم فریفتہ رخ نیکو و اشفتہ زلف او بود۔ در وقت احمد شاہ ہنگامہ حسن او گرم بود۔ ایں ہمہ شاہزادے و سلاطین مانند پروانہ دل خود را بر شعلہ حسنش می سوختند و او نیز با نیہا صحبت می داشت .... میر طیبا سلمہ اللہ نظر الفت می داشتند چنانچہ تا حال بر وقت کہ یاد او می کنند می گریند"۔

جعفر علی خاں ذکی:۔

"سوائی رام راجہ بود بروتعشق داشت"۔

محمد افضل افضل:۔

"ہر کدام ہندو بچہ گوپال نامی بود کہ عاشق شدہ"

میر عبد الحی تاباں:۔

"بایک طفلے سلیمان نامی تعشق داشت"۔

نور اللہ:-

بریک فرنگی بچہ بعشق بہم رسانیدہ

مرزا رضا علی رضا:-

"بر شخصے وہب علی عاشق است"

سلیمان:-

"معشوق عبدالحئی تاباں است"

تذکرۂ گلزار ابراہیم کا مصنف ان شعراء کے علاوہ
اور لوگوں کے نام بھی بتاتا ہے۔

مہتاب رائے رتسوا

"بر منوں نامی عاشق شدہ"

محمد چاند رخشاں:-

بر زعفران نامی عاشق شدہ

ملا عبدالمومن دہلوی جو ملا دو پیازہ کے نام سے مشہور ہیں
اس عہد کے جید علماء میں سے تھے اور بہت ظریف الطبع
نے چند ورق کی ایک فرہنگ لکھ کے اس وقت کی سیاسی
اقتصادی تمدنی اور معاشرتی حالت کی تصویر کھینچ دی
مثلاً۔

البادشاہ	کامل زبان
الوزیر	ہدف تیر آہ بیچارگان
النواب	مجموعہ تغافل
البیوقوف	کروری دیانت دار
التیزدو	نوکر ماہیانہ نامشخص

الغلام	مشتاق طعام
الامیرزادہ	کون دہندہ بہوس
الامرد	رہنمائے شہوت

اس وقت دہلی کا تمدن ان اجزاء کا مجموعہ تھا
خوف وہراس۔ حسرت ویاس۔ نکبت وافلاس۔ بزدلی اور
امرد پرستی۔ اس فضا میں صوفیانہ شاعری کو ترقی ہوئی جو امرد پرستی
کا بہانہ ہوتی ہے

جب تاتاریوں نے اسلامی دنیا کو تہ وبالا کیا خوارزمیوں
کی حکومت اور بنی عباس کی سلطنت برباد کرکے عجم سے عرب تک
خاک اڑادی۔ زمین آسمان میں سناٹا چھا گیا۔ امیرزادے اور
صاحبزادے بھیک مانگنے لگے تو اس زمانے میں بھی تصوف
اور امرد پرستی کو عروج ہوا۔ مولانا شبلی نے یہ داستان اس
طرح بیان کی ہے:-

اس زمانہ میں امرد پرستی کا عام مرض پھیلا ہوا تھا صوفیہ
اور اہل نظر اس کو عشق حقیقی کی منزل اولیں قرار دیتے
تھے اور ارباب ذوق کے لیے تفریح خاطر کا اسکے سوا
کوئی سامان نہ تھا۔ شیخ (سعدی) چونکہ اس سانپ
کو کھلا چکا تھا۔ اس کی مضرتوں سے خوب واقف تھا
اس لئے نہایت سختی سے اسکی برائیاں کی ہیں ؎

سراز مغز دست از درم کوتہی — چو خاطر بفرزند مردم نہی
مکن بد بفرزند مردم نگاہ — کہ فرزند خویشت برآید تباہ

صوفیہ کا پردہ اس طرح کھولتے ہیں ؎

گرچہ بے نشیند با خوش پسر — کہ ما پاکبازیم و اہل نظر

صوفیوں کے اس دعوے کو کہ جمال سے ہم کو صنعت ایزدی کا مطالعہ مقصود ہوتا ہے اس طرح رد کرتے ہیں ؎

چرا طفل یک روزہ ہوشش نہ برد — کہ در صنع دیدن چہ بالغ چہ خورد

محقق ہماں بیند اندر ابل — کہ در خوبرویان چین و چگل

یعنی صنعت ایزدی کا مطالعہ مقصود ہے تو وہ ذرہ ذرہ اور چپہ چپہ میں نظر آتی ہے۔ خوش جمال اور پری جمال کی کیا تخصیص ہے۔ ایک باریک بین کو اونٹ کے ناموزوں ڈیل ڈول میں بھی وہی صنعت کاریاں اور نکتہ آفرینیاں نظر آتی ہیں جو چین و چگل کے معشوقوں میں ہیں۔

ریاکار عالموں کی قلعی سب نے کھولی ہے لیکن صوفیہ کا گروہ جو ہمہ تن ریاکار ہے۔ ان کی نسبت کسی کو ریاکاری کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ اور ہو بھی تو عوام کے ڈر سے ظاہر نہیں کر سکتا شیخ (سعدی) اس راز سے خوب واقف تھا۔ اس لئے اس نے نہایت لطیف پیرایوں میں اس مضمون کو ادا کیا ہے ؎

بروں نمی رود از خانقہ یکے ہشیار — کہ پیش شحنہ بگوید کہ صوفیان مستند

محتسب در قفائے رنداں است — غافل از صوفیان شاہد باز [1]

یہی حالت اس وقت دہلی کی تھی تباہی و بربادی سے ہر دل پر غم و الم کی گھٹا چھائی ہوئی تھی اس لئے صوفیت اور امردپرستی کی شاعری شروع ہوئی جس میں مایوسی۔ ناکامی۔ پریشان حالی۔ زمانہ کی شکایت

[1] شعر العجم حصہ سوم از صفحہ ۶۰ تا ۶۲

زندگی سے نفرت کے مضامین اور امارد سے ہوس رانی کا نہایت بے تکلفی سے ذکر تھا ؎

جن بلاؤں کو میرؔ سنتے تھے — ان کو اس روزگار میں دیکھا

جہاں کو فتنہ سے خالی کبھی نہیں پایا — ہمارے وقت میں تو آفت زمانہ ہوا

دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا
جو کچھ کہ غم ہے سو افسوس ہے جوانی کا

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا — بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا

وہ دن کدھر گئے کہ ہمیں بھی فراغ تھا — یعنی کبھو تو اپنے بھی دل تھا دماغ تھا

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

جب تب ملتا ہے بازاروں میں میرؔ — ایک لوطی ہے وہ ظالم سرفرشی

جو لونڈا نام حسن امردپرستی کا چڑھے جو نکلے
میں اس کو بیچ دے با تو نہیں لگ جاتا ہوں جوں لاسا

[illegible] ہو امارد سے کہ یا رب کریم — کاش دے حور کے بدلے میں تو غلماں مجھکو

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

زبس ہم کو نہایت شوق ہے امردپرستی کا
جہاں جاویں وہاں اک دو کو ہم تاک رکھتے ہیں۔

ان شعروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں امردپرستی کا کتنا رواج

[illegible] اس لفظ کا اپنی زبان پر لانا خلاف تہذیب سمجھتے ہیں۔

تھا کہ اس کے اظہار میں کسی کو جھجک نہیں ہوتی تھی۔ جب کوئی عیب
سوسائٹی میں عام ہو جاتا ہے تو وہ عیب نہیں رہتا۔

لکھنؤ کا تمدن

لکھنؤ کے تمدن کے ترکیبی اجزاء معلوم کرنے
آپ کو اکبر اور جہانگیر کے زمانہ کی سیر کرنا ہوگی
کیونکہ جو تمدن یہاں پیدا ہوا وہ اسی سلسلہ کی آخری کڑی تھا۔
آشنا سب جانتے ہیں کہ اکبر امی ہونے کے باوجود ایسا جو
ستناس اور علم و فن کا قدردان تھا کہ دنیا بھر کے باکمالوں کو
اپنے یہاں کھینچ بلایا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں ایران
آنے والے شاعروں کی جو فہرست لکھی ہے اس میں پچاس
نام ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں ہر علم کے عالم اور ہر
کے کامل ایسے اور اتنے جمع ہو گئے تھے کہ دنیا بھر میں کہیں نہ
جب دہلی مغل اعظم کا پایۂ تخت بنی تو یہ تمام کمال وہاں
جمع ہو گئے اور طبیب و شاعر۔ محدث و مفسر فلاسفر و ر
بہندس و معمار۔ تاجر و دستکار۔ منجم و رمال۔ مطرب و قوال
داستان گو و نقال ہر طرح کے لوگوں کی ایک بھیڑ لگ گئی۔

ادھر زمانے نے دہلی کا ورق الٹا ادھر شجاع الدولہ
فیض آباد میں مسند لگائی۔ یہ خبر سنتے ہی رات دن قافلوں کے
آنے کا تانتا بندھ گیا اور کچھ ہی دنوں میں ہر طبقہ کے لوگ
کثرت سے آ کے بس گئے کہ دہلی اجڑ گئی اور فیض آباد کی یہ حا
ہو گئی کہ شہر کے اندر جگہ نہ رہی تو باہر نکل کے لوگوں نے سکونت
اختیار کی۔

شہر کے اندر عالی شان باغ اور سیرگاہیں اور بہ

اور شکارگاہیں بنائی گئیں جن کی شہرت سن کے شاہ عالم خود
دیکھنے آئے۔

چونکہ شجاع الدولہ نے انگریزوں سے شکست کھائی تھی اس
فوج کی طرف خاص توجہ تھی۔ توپوں اور بندوقوں کے ڈھالنے
کا کارخانہ فرانسیسیوں کی نگرانی میں تھا جس میں دو سو فرانسیسی
تھے جنھوں نے بڑی بڑی توپیں اور ایسی ایسی بندوقیں بنائی
کہ انگریزی بندوقیں مات ہو گئی تھیں۔

تقریباً ایک لاکھ سوار اور پیادے ہر وقت فیض آباد میں موجود
رہتے تھے۔ ان کے علاوہ بائیس ہزار مخبر اور ہرکارے تھے جو
دکن، پونا اور کابل سے خبر لاتے تھے۔

شہر کے اندر راستہ چلنا دشوار تھا ہر دم گھوڑوں، ہاتھیوں
خچروں، شکاری کتوں، گایوں۔ بھینسوں، بیلوں۔
اور توپوں کے گزرنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

چینی، فرانسیسی، انگریزی، کابلی، ایرانی سوداگر قیمتی
مال لئے ہر وقت موجود رہا کرتے تھے۔

بڑی بڑی درس گاہیں تھیں جن میں اس زمانہ کے مشہور
علما درس دیتے تھے۔ ان درس گاہوں کی اتنی شہرت تھی کہ
بنگال اور کابل تک سے طالب علم آتے تھے۔

شجاع الدولہ ملک کے انتظام سے فارغ ہو کے مہ جبیں عورتو
اور سرود کی صحبتوں سے جی بہلاتے تھے اس وجہ سے ارباب
نشاط کی کثرت ہو گئی تھی کہ کوئی گلی کوچہ ان سے خالی نہ تھا
اور امیروں کے انعام و اکرام سے وہ دولت مند ہو گئی تھیں

آصف الدولہ نے فیض آباد کو خیرباد کہہ کے لکھنؤ آباد کیا تو
سجی سجائی محفل مع اپنے تمدن کے یہاں جمی۔ داد و دہش اور قدر
کی کشش نے آس پاس اور دور دراز کے بچے کھچے لوگوں کو
کھینچ لیا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں یہ شہر عقل و دانش میں
کا خطہ اور زیب و آرائش میں بہشت کا نمونہ بن گیا۔ میر علی لطف
نے گلشن ہند میں لکھا ہے کہ:۔

"ایک ایک کمال کا ہزارہا آدمی موجود تھا"۔

عمارت کی طرف اتنی توجہ تھی کہ ہر روز ایک نئی عمارت کی
رکھتے تھے

آصف الدولہ نے انگریزوں کے مشورے سے فوج کم کرا
اس خوش تدبیری اور کارگذاری کے صلے میں انھوں نے روہیلکھنڈ
پران کا قبضہ کرا دیا۔ ادھر فوج کم ہونے ادھر روہیلکھنڈ ملنے
آمدنی بہت بڑھ گئی جو شان و شوکت اور عیش و عشرت میں دل کھول
کے صرف کی گئی جس سے لکھنؤ عیش و عشرت اور دولت و ثروت
کا گھر بن گیا۔ اس کی ایک مثال وزیر علی خاں کی شادی تھی۔ جس
متعلق مولانا شرر لکھتے ہیں:۔

وزیر علی خاں کی شادی میں انھوں نے (آصف الدولہ)
ایسا حوصلہ دکھایا کہ برات کا تزک و احتشام تاریخ ار
کے تمام تکلفات سے بڑھ گیا۔ برات کے جلوس میں بارہ سو
ہاتھی تھے۔ دولہا جو شاہی خلعت پہنے ہوئے تھا اس
میں بیس ۲۰ لاکھ کے جواہرات ٹکے ہوئے تھے۔ محفل طرب
کے لئے دو عظیم الشان اور پر تکلف شامیانے بنوائے

گئے تھے۔ جن میں ہر ایک ساٹھ فٹ بلند تھا اور ایسا عمدہ
اور نفیس اور قیمتی کپڑا لگایا گیا تھا کہ ان دونوں کی تیاری
میں سلطنت کے دس لاکھ روپے صرف ہو گئے تھے۔
(گزشتہ لکھنؤ)

علمائے فرنگی محل اورنگ زیب کے زمانہ سے لکھنؤ میں علمی مسند
بچھائے بیٹھے تھے اور یہاں کا درس نظامی عراق و ایران تک میں جاری
تھا۔ اسی زمانہ میں غفرانمآب نے فرنگی محل کے مقابلہ میں اپنی مسند
الگ بچھائی اور شیعوں کی جمعہ و جماعت قائم کی۔ علم کلام و مناظرہ میں
بڑی زوردار کتابیں لکھیں۔ جن میں مولانا دلدار علی غفرانمآب عماد الاسلام
وہ حیرت انگیز کارنامہ ہے جس کی نظیر دنیا میں موجود نہیں۔ عربی علوم
کا اتنا چرچا ہوا کہ اساتذہ اور طلباء اپنی مخصوص وضع میں ہر گلی کوچے
میں گھومتے نظر آنے لگے۔

آصف الدولہ شاعر بھی تھے اور بہت پاکیزہ مذاق رکھتے
تھے۔ اس لئے شعراء کی قدردانی بھی دل کھول کے کی اور شاعروں
کا ایک زبردست مجمع ہو گیا۔ سوز۔ میر۔ سودا ایسے باکمال اسی
زمانہ میں آئے اور میر حسن کی مشہور مثنوی اسی عہد میں لکھی گئی۔
طب یونانی کے بڑے بڑے ماہر جمع ہو گئے۔ حکیم نبا ایسا شیخ
وقت اسی دور کی یادگار ہے۔

اگرچہ آصف الدولہ نے فوج کم کر دی مگر سپاہیوں کا ٹھکانا
سوائے لکھنؤ کے اور کہیں نہ تھا اس لئے وہ شاہی نوکری سے علیحدہ
ہونے کے بعد بھی لکھنؤ میں رہ کے رئیسوں کی سرکار میں کھپ گئے۔
اس طرح فوج ٹوٹنے پر بھی لکھنؤ میں سپاہیوں کی کمی نہ رہی اور

سپہ گری کا فن یہاں ترقی کرتا رہا۔ رئیسوں سے لے کے عالموں تک جس کو دیکھو سپہ گری کے فن میں کامل تھا۔ بانک۔ جل بانک۔ کشتی۔ بنوٹ، برچھا، بانا، تلوار، کٹار، تیر اندازی، شہ سواری، ایسے ہنر تھے جن کا جاننا ہر شریف آدمی کو ضروری تھا۔ ان فنوں میں کمال رکھنے والے لکھنؤ سے بڑھ کر کہیں نہ تھے۔ جنھوں نے اس میں نئی نئی راہیں نکالیں۔ لکڑی میں علی مد خاص لکھنؤ کی ایجاد ہے جس کے موجد محمد علی خاں ساکن کٹرہ بزن بیگ تھے۔

شجاع الدولہ کے وقت سے ارباب نشاط اور گانے والیاں دہلی اور دور و دراز مقامات سے آ کے فیض آباد میں آباد ہو گئیں تھیں جو آصف الدولہ کے ساتھ لکھنؤ آئیں۔ اور وہ مہ جبین عورتوں سے پرستان بن گیا۔ اور شاہد پرستی عام ہو کر رئیسوں کی وضع میں داخل ہو گئی۔

موسیقی کو اتنا عروج ہوا کہ لکھنؤ اس کا ایک بڑا مرکز بن گیا اور علم و دانش کے پرستاروں نے اس کے آگے سرِ نیاز جھکایا۔

حکومت اودھ کے مشہور منصب دار تفضل حسین خاں جن کے متعلق آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ ابو الفضل کے بعد اگر کسی کو علامہ کا خطاب زیب دیتا ہے تو وہ تفضل حسین خاں تھے۔ یہ موسیقی کے زبردست ماہر تھے۔ اصول النغمات الآصفیہ ایسی کتاب اسی زمانہ میں لکھی گئی۔ رفتہ رفتہ اتنی ترقی ہوئی کہ اس فن کے مخصوص اصول ایجاد ہوئے۔ ہندوستان میں لکھنؤ اور بنارس موسیقی کے دو اسکول آج تک تسلیم کئے جاتے ہیں۔

ہر چیز میں تکلف اور نفاست پیدا کرنے کا شوق شجاع الدو(لہ)

زمانہ سے چلا آرہا تھا اور لکھنؤ کے تمدن کا خاص جزو تھا۔

آصف الدولہ کے بعد وزیر علی خاں کی چند روزہ حکومت نواب سعادت علی خاں کا زمانہ اگرچہ سیاسی الجھنوں میں گزرا لیکن عمدہ عمدہ عمارتیں بن کر تیار ہوئیں اور دور دور سے اہل کمال آکے آباد ہوئے۔ مصحفی و انشا ایسے استادانِ فن اسی دور کی یادگار اور اسی دربار کے وظیفہ خوار تھے۔

سعادت علی خاں کے بعد غازی الدین حیدر کا دورِ حکومت آیا۔ انھوں نے باپ کے سارے منصوبے بھلا دیئے اور اپنے کو انگریزوں کے حوالہ کر دیا جنھوں نے انھیں بادشاہ بنا کے دہلی سے آزادی کا اعلان کر دیا۔ دولت کی فراوانی۔ سکون و اطمینان کی زندگانی۔ سعادت علی خاں کا جمع کیا ہوا سترہ کروڑ روپیہ پانی کی طرح بہا کے عیش و عشرت کی محفل جمائی۔ اس زمانہ میں ہندوستان کے رہے سہے اہل کمال بھی کھنچ آئے۔

ادھر ناسخ نے زبان کی اصلاح کر کے دہلی کے مقابلہ میں اپنی دبستان الگ قائم کی جس نے دہلی اور تمام ہندوستان کو متاثر کر دیا۔ غازی الدین حیدر کے بعد نصیر الدین حیدر حکمراں ہوئے انھوں نے باپ کی تمام خصوصیتوں کو قائم ہی نہیں رکھا بلکہ ترقی دی۔ عورتوں سے ان کو دلچسپی بڑھا دی کر خواصی میں حبشیوں کی پلٹن کے بجائے نہایت حسین اور پری تمثال عورتیں تھیں جو سایہ کی طرح ساتھ رہتی تھیں۔ یہ منظورِ نظر نہ تھیں بلکہ حفاظتی دستہ کا کام انجام دیتی تھیں جسے آج کل کی اصطلاح میں باڈی گارڈ کا رسالہ کہتے ہیں۔ ان کے بنانے میں بڑی تلاش اور حسن انتخاب سے کام لیا گیا تھا

ان کا حلیہ اور وردی یہ تھی۔ ہلکا ہلکا گلابی رنگ۔ رخساروں سے خون
جھلکتا ہوا۔ ان گورے گورے چہروں پر زرتار موباف سے بندھی ہوئی
چوٹیاں جن میں جڑاؤ سیس پھول لٹکتے ہوئے ایک چست کرتی جس
سے سینہ کا ابھار نمایاں۔ لمبان کمر تک۔ آستینیں ندارد۔ بازو شانے
تک کھلے۔ اطلس کے کلی دار پائجامے۔ کمر کولوں میں پھنسے ایک زرد زری
کی پیٹی کسی ہوئی جس کے برابر کرتی کی گوٹ عجب حسن پیدا کرتی تھی۔
کلائیوں میں مرصع کنگن اور کڑے۔ بازوؤں پر نورتن اور بھوج بند
سر پر آب رواں کا دوپٹہ شانوں اور کمر سے لٹکتا ہوا۔

اس حسن اور اس بناؤ کے ساتھ بادشاہ کے پیچھے مگس رانی
کرتی تھیں۔ ان کے آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے میں سینہ کا ابھار اور
ہر جنبش میں کمر کولوں کا جھونک دیکھنے والوں پر بجلیاں گراتا تھا مگر
کس میں ہمت تھی جو آنکھ اٹھا کے دیکھتا یہ تو انھیں تجربہ کار نظر بازوں
کا کام تھا جن کے لیے شاعر کہہ گیا ہے ؎

دل و جانم بتو مشغول و نظر در چپ و راست
تا نہ دانند رقیباں کہ تو منظور منی

شاہدان حسن سے بزم عیش گرم رکھنا۔ جانوروں کی زور آزمائی
کا تماشا دیکھنا۔ سیر و شکار سے جی بہلانا۔ شہسواری کا کمال دکھانا
روز کا مشغلہ تھا۔ اسکے باوجود علمی ذوق بھی تھا۔

ایک بہت بڑی درسگاہ قائم کی تھی جس کے نگراں اس وقت
کے مشہور ہیئت داں کرنل ولکاکس تھے۔

عربی علوم کی بڑی بڑی درسگاہیں تھیں جن میں معقول و منقول
فقہ و اصول، حدیث و تفسیر کلام و مناظرہ ادب و تاریخ کا

درس ہوتا تھا اور جامعیت علوم کے اعتبار سے لکھنؤ دنیا کا سب
سے بڑا مرکز تھا۔ مولانا شرر لکھتے ہیں :-

بخارا۔ خوارزم۔ ہرات۔ کابل۔ اس کے آگے سر جھکاتے
تھے اور ساری اسلامی دنیا یہیں کی شاگردی پر فخر کرتی
تھی۔

غفرانمآب کے بڑے بیٹے سلطان العلماء سید محمد رضوان مآب
ان کا ذکر اودھ کی تاریخ میں بار بار آتا ہے اور غالب کے خطوط میں
مجتہد العصر سلطان العلماء سے یہی مراد ہیں۔

مفتی میر عباس صاحب جو ایک کثیر التصانیف عالم اور مشہور
ادیب تھے انھیں سلطان العلماء کے میر منشی اور ان کے چھوٹے بھائی
سید العلماء سید حسین علیین مکان کے شاگرد تھے۔ انھوں نے
عراق کے مشہور عالم صاحب جواہر کے نام ایک خط لکھا کہ میرا دل
چاہتا ہے عراق آکر آپ حضرات کی خدمت میں شرفیاب ہوں اس
کے جواب میں صاحب جواہر تحریر فرماتے ہیں کہ آپ کا وہاں رہنا اور
سلطان العلماء و سید العلماء کی مجلس درس میں حاضر رہنا بہترین
نعمت اور خدا کا بہت بڑا احسان ہے اس کو ہاتھ سے نہ دیجئے[1]
اس سے لکھنؤ کی علمی عظمت کا اندازہ کیجئے :-

ایام محرم کے زمانہ میں تعزیہ داری اس شان اور اہتمام سے ہوتی
تھی کہ عراق و ایران گرد ہو گئے۔ بادشاہ سے کر فقیر تک رقص و سرود
کے جلسے بند کر کے ماتم دار بن جاتے اور سیاہ کپڑے پہن کے سوگ

[1] ظل ممدود مصنفہ مفتی میر عباس صاحب

مناتے گھر گھر مجلسیں ہوتیں اور گلی گلی تعزیہ آ کھتے۔ ہندو مسلمان تعزیہ داری کرتے۔ جس کی یادگاریں آج تک موجود ہیں۔

تمام دنیا میں محرم کے دس دن تعزیہ داری ہوتی ہے لیکن اس زمانہ میں بجائے دس دن کے آٹھویں ربیع الاول تک پورے دو مہینے عزاداری ہونے لگی جو آج تک قائم ہے۔

غفرانمآب کے امام باڑے میں مجلسوں کے بعد شبیہیں دکھانے کا طریقہ شروع ہوا۔ نویں محرم کو حاضرین کے سامنے اونٹ لائے جاتے جس کے کجاوؤں اور محملوں پر سیاہ پوشش پڑی ہوتی تھی جس سے یہ منظر سامنے آجاتا تھا کہ کربلا میں اہل بیت کا لٹا ہوا قافلہ کس مظلومی اور ستم زدگی کی شان سے شام کی طرف جا رہا تھا۔ اس منظر کا ایسا اثر پڑتا کہ لوگ بے اختیار رونے لگتے۔ مولانا شررؔ نے اس کو خاندان اجتہاد کا کارنامہ قرار دیا ہے لیکن حقیقت میں یہ طریقہ انھوں نے ایران سے سیکھا تھا جہاں اس قسم کی شبیہیں نکالی جاتی ہیں۔ سلہ

سلہ ممکن ہے کسی کو ناگوار ہو کر مولانا شررؔ کا دیا ہوا تمغہ میں نے چھین لیا لیکن حقیقت نگاری کو جانبداری اور جھوٹی مدح سرائی سے ربط نہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ میں خاندان اجتہاد کی خدمتوں کا منکر ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ غفرانمآب کے زمانہ سے تعزیہ داری کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ انھوں نے اس سے مذہبی تبلیغ۔ قومی تنظیم اور شیعی تمدن کی ... کا کام لیا۔ ایک نئے تمدن کا آغاز کیا۔ ایک جدید قسم کی تعزیہ داری کو رواج دیا اور اپنے وصیت نامہ میں اسکی ترویج کی تاکید کی جب سے ... ترقی و تحفظ ان کے خاندان کا مستقل مشن ہے جس میں علماء کی سیرت کو ...

(باقی اگلے صفحہ پر)

موجودہ مرثیہ اسی دور کی پیداوار ہے جس نے لکھنؤ سے باہر نکل کر پورے ہندوستان میں مجلس کے قیام میں مدد کی۔ بادشاہ خود بھی شاعر تھے اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اور مجلس

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ : ۔ بھی نظر انداز کر دیا گیا۔ مثلاً عراق و ایران کے مجتہدین مجلس پڑھنا اپنے مرتبہ کے خلاف سمجھتے ہیں مگر ان کے خاندان کے مجتہدین مجلس پڑھتے اور رسم و سامان عزا میں بھی اصلاح و اضافے کرتے رہے ہے محرم کے دس دن میں ہر دن ایک شہید کے ذکر سے مخصوص کرنا۔ طبل تاشا جنگی باجا) حاضری۔ تابوت ذوالجناح کا اضافہ کیا جس کا ... نہ تھا ان کے بیٹے سید محمد سلطان العلماء نے جمعرات کی مجلس نوچندی کو زیادہ اہتمام ہوتا تھا۔ ۱۳۴۵ھ میں عمدۃ العلماء ... حسین صاحب نے مجلس شام غریباں قائم کی جو اب سارے ہندوپاک ... عزاداری کا جزو بن چکی ہے۔

۱۳۶۱ھ میں سید العلماء مولانا علی نقی مجتہد نے سیزدہ صد سالہ ... قائم کی اور امام حسینؑ کو دنیا کے سامنے ایک کامل انسان ... متعارف کرانے کا پروگرام بنایا ہر شہر میں جلسے منعقد کرائے ... مذہب کے لوگوں نے امام حسینؑ کو ایک انسان کامل کی حیثیت ... کی دعوت دی۔ ہر طبقہ کے لوگوں کو امام حسینؑ کے ... متعارف کرایا۔ خود شہید انسانیت ایسی کتاب لکھی جیسی ... پہلے کوئی کتاب تھی نہ آئندہ کوئی لکھ سکے گا۔

... خاندانی عداوت رکھنے والوں نے کتاب کی اہمیت اور

بھی بادشاہ تھا۔

ناسخ و آتش ایسے باکمال اسی بادشاہ کے وظیفہ خوار
خلیق وضمیر اسی دور کی پیداوار تھے۔

یہی وہ زمانہ ہے جس میں لکھنؤ کی خصوصیتیں شباب پر آئیں
ادب آداب میں انتہائی تراش خراش برتی جانے لگی۔ چھینکنا۔
جماہی لینا۔ کھانسنا۔ ہنسنا۔ انگڑائی لینا۔ آداب مجلس کے خلاف
تھا۔ اکثر لوگوں کو اس فطری حرکت پر جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔

دولت مندی کا یہ عالم تھا کہ نجف فقیر ہاتھی پر بھیک مانگ
نکلتے تھے۔

فن سپہ گری کو بہت ترقی ہوئی۔ بادشاہ خود بھی شہسوار
میں کمال رکھتے تھے جو سپہ گری کا ایک اہم جزو ہے۔ سپاہیا
بانکپن اس قدر عام تھا کہ ایک انگریز مصنف لکھتا ہے کہ:۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ:۔ یہ یادگار قائم ہو چکی ہر صدی کا
اس کو اپنے ساتھ لائے گا اور امام حسین کو ایک نئے زاویہ نگاہ
سوچنے کا آغاز ہو چکا۔ آنے والی نسلوں کی رہنمائی کے لئے ایک
منارۂ روشنی قائم ہو چکا اور ان سب کے بانی کی حیثیت سے تار
نے سید العلماء کا نام نوٹ کر لیا ہے

خیال زلف بتاں میں نصیر پیٹا کر
گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

در یہاں کے فقیروں میں بھی اکڑ تکڑ پائی جاتی ہے۔"
لوگ عام طور پر سپاہیانہ وضع میں رہتے تھے۔ چنانچہ یہی انگریز
مصنف اپنی چشم دید حالت یہ بیان کرتا ہے:۔

میں ایک ذاتی کام سے اول مرتبہ وارد لکھنؤ ہوا اس وقت
نصیر الدین حیدر خلف و جانشین غازی الدین حیدر فرماں روائے
سلطنت اودھ تھے۔ میں نے زمانہ قیام کلکتہ میں لکھنؤ کی نرالی
ادائیں اور دربار شاہ اودھ کی عجیب داستانیں سنی تھیں
یعنی یہ کہ باشندگان اودھ میں
خاص قدرتی مبارزت ہے۔ اور یہ کہ لکھنؤ کے گلی کوچوں میں
بہت سے مہیب صورت لوگ ڈھال تلوار اور بندوق
اور پستول سے مسلح نظر آتے ہیں
مجھے تمام امور کا یقین کامل ہو گیا کیونکہ یہاں میں نے جو کچھ اپنی
آنکھوں سے دیکھا وہ میرے وہم و خیال سے بھی زیادہ تھا
بیر بشپ صاحب نے ڈریسڈن اور دوسرے سیاحوں نے لکھنؤ
کو ماسکو سے مشابہ بتلایا ہے
ڈریسڈن ماسکو، قاہرہ جس سے چاہیے آپ لکھنؤ کو مشابہ
قرار دیجیے مگر میرے نزدیک لکھنؤ کی ایسی عجائب روزگار
چیزیں ان مقامات میں سے کہیں نظر نہ آئیں گی۔ اور لا
لکھنؤ کے ایسے ہتھیار بند آدمی ان شہروں میں کہیں نظر نہ
آئیں گے۔ ماسکو کے باشندے صرف چھری باندھتے ہیں
اور قاہرہ کے لوگوں کے ہاتھ میں کچھ ہتھیار کبھی
کبھی دکھائی دیتے ہیں۔ برخلاف اس کے لکھنؤ کے باشندے

بالعموم اوبچی بنے نظر آئیں گے۔ ان کے پاس ڈھال تلوار اور بندوق یا پستول ضرور ہوگی۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو کاروبار روزمرہ کرتے ہیں وہ بھی تلوار تو ضرور باندھتے ہیں اور کوچہ گرد حضرات جب سیر گشت کو نکلتے ہیں تو چاہے کیسی ہی ذلیل پوشاک کیوں نہ پہنے ہوں مگر تمنچے کی جوڑی اور ڈھال دونوں لگائے ہوں گے۔ بھینسے کی کھال منڈھی ہوئی ڈھال جس میں پیتل کے پھول لگے ہوتے ہیں اکثر بائیں کاندھے پر پڑی ہوتی ہے۔ بڑی بڑی مونچھوں والے مہیب صورت راجپوت اور پٹھان اور سیاہ داڑھی والے مسلمان تلوار سے لیس تمنچے برتے نظر آتے ہیں اور اہل لکھنؤ کے مزاج خودی وخود پسندی کو ظاہر اور جوش نبرد آزمائی کو بخوبی عیاں کرتے ہیں۔ یہ امر کہ کیوں اہل لکھنؤ بالعموم سپاہیانہ وضع رکھتے ہیں۔ تعجب خیز نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ کمپنی کی فوج میں اودھ ہی کے پرورش یافتہ بکثرت ہوتے ہیں اور احاطۂ بنگال کی تمام تر فوج یہیں کے باشندوں سے مملو ہے۔

باشندگان لکھنؤ میں اسلحہ کا مذاق بچپنے ہی سے پیدا کر دیا جاتا ہے۔ تیر اور برچھے یہاں کے لڑکوں کے معمولی کھلونے ہیں اور جس طرح انگریزی دائیاں بالعموم لڑکوں کے ہاتھ میں جھنجھنے دے دیتی ہیں اسی طرح یہاں چھوٹے تمنچے اور کاٹھ کی تلواریں کھیلنے کو پکڑا دی جاتی ہیں۔ اس شہر کے گلی کوچے میری نظروں میں بالکل انوکھے معلوم ہوئے گویا کہ عالم رویا میں میرا گزر دفعتہً کسی ایسے عجیب ملک

میں ہوا ہے جہاں خاص و عام پہلوان ہی پیدا ہوتے ہیں جن کے بشرے سے جنگ جوئی ٹپکتی ہے اور جن کا تذکرہ میں نے لڑکپن میں قصوں اور کہانیوں کی کتابوں میں پڑھا تھا۔[1]

انیس نے اپنے مرثیوں میں اسی زمانہ کے تمدن و معاشرت کی تصویر کھینچی ہے۔ تلوار کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

اسلاف کا بناؤ رئیسوں کی شان ہے   شاہوں کی آبرو ہے سپاہی کی جان ہے

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اودھ اخبار میں ایک سلسلہ مزاحیہ افسانوں کا شروع کیا تھا جو بعد میں فسانہ آزاد کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو کر مقبول ہوا۔ اس کی نوعیت یہ تھی کہ میاں آزاد لکھنوی ایک شخص کو لکھنؤ کی مختلف محفلوں، بازاروں اور میلوں وغیرہ میں لے جا کے وہاں کی حالت بیان کی ہے اور تقریباً ہر جگہ لکھنؤ کے تمدن و معاشرت کی تصویر کھینچی ہے۔ اسی مرقع کی ایک تصویر ملاحظہ ہو۔

میاں آزاد اور بانکے پھر شہر میں چکر لگانے لگے چوک میں پہنچے تو جس پر نظر پڑی بانکا۔ ترچھا۔ ٹیکھا۔ چُنَّٹ دار انگرکھے پہنے تکمے دار ٹوپیاں سر پر جائے چست گھٹنے دار اڑدوے پڑے۔ ڈھاٹے باندھے ہوئے چلے جاتے ہیں تمنچے کی جوڑی کمر سے لگی ہوئی دو دو دلائیاں چڑھی ہوئی۔ قرابچہ۔ پیش قبض۔ کٹار۔ سروہی۔ شیر بچہ سب سے لیس ماشاءاللہ اوبچی بنے ہوئے۔ ایک بانکے کو دیکھ کر دکاندار ہنس پڑا

[1] اودھ آف این ایسٹرن کنگ مترجمہ منشی احمد علی بی اے [illegible] (مرقع اودھ)

انھوں نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ وَن سے تمنچہ داغ دیا مگر حسنِ اتفاق سے خالی گیا۔ لوگوں نے پوچھا کیوں آغا کیوں بگڑ گئے۔ تیکھے ہو کر فرمایا۔ ہم کو دیکھ کر بچاجی مسکرائے تھے۔ ہم نے گولی لگائی کہ دانت پر پڑے اور اس جواب دنداں شکن سے ان کے بھی دانت کھٹے ہو جائیں [1]

شیخ ممتاز حسین صاحب مرحوم ایڈیٹر اودھ پنچ لکھتے ہیں:۔ لکھنؤ وہ مقام ہے جہاں کے بانکے سپر یا زرہ بکتر سے جسم کی حفاظت کرنا ننگ و عار سمجھتے تھے۔ شر بتی کے انگرکھوں پر تلواریں کھانا ان کا شعار تھا۔ یہاں کی خاک نے فنون سپہ گری کے ایسے ایسے کامل پیدا کئے جن کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا [2]

لکھنؤ میں بانکوں کا ایک خاص گروہ تھا جن کے خصوصیات اور کمالات پنڈت رتن ناتھ سرشار نے یہ بیان کئے ہیں:۔

ہر ایک بانکے کا ایک مخصوص رنگ ہوتا تھا اور ٹوپی سے لے کر جوتے تک ہر چیز اسی رنگ میں رنگی ہوتی تھی۔ شہر میں کوئی اس رنگ کا جوڑا پہن نہیں سکتا تھا۔ فن سپہ گری میں یہ لوگ کامل ہوتے تھے اور اس میں ایسے ایسے کمال دکھاتے تھے کہ عقل حیران ہو جاتی تھی۔ مثلاً رومال اچھالا اور دو ٹکڑے کر دیا۔ لیمو پر نشان لگایا اور تلوار سے اڑایا تو نشان کے پاس سے دو ٹکڑے۔ کسیرو اچھالا اور پانچ چھ وار میں چھیل ڈالا۔ چراغ جلایا اور کھانڈ اُچھلتے بھنچتے گل کاٹ ڈالا

[1] گذشتہ لکھنؤ۔ [2] تنقید شعر الہند

کو الگ بتی الگ۔ ایک پیالہ میں دس کوڑیاں رکھیں اور دو پر نشان بنایا۔ دونوں کو پیالہ میں تلوار سے کاٹ دیا۔ باقی کوڑیاں بلوہ بچ گئیں۔ لکڑی ٹیکی اور چھت پر پہنچ گئے۔ گتکے کا ذرا اشارہ کیا اور بیس بیس ہاتھ اڑ گئے۔ چالیس چالیس آدمیوں نے گھیرا اور صاف نکل گئے۔ پلنگ کے نیچے ایک جنگلی کبوتر چھوڑ کر اس کو نکلنے نہ دیا۔

مولانا عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں کہ:۔

جتنے بانکے تھے اتنی ہی دھجیں تھیں۔ کوئی صاحب دو دھارا تیغا ہاتھ میں رکھتے جو ہر وقت برہنہ اور ہوا سے لڑتا رہتا کوئی رستم و نریمان کے زمانہ کا وزنی گرز لئے پھرتے۔ کوئی صاحب تبر کاندھے پر رکھے نظر آتے اور ساری دنیا کو اپنی نظر میں ہیچ خیال کرتے ——— تبختر و نخوت کے ٹھاٹھ سے اپنے اوپر ناز کرتے ہوئے چلتے۔ ہر ایک پر کڑے تیور ڈالتے کیفیت یہ تھی کہ ان لوگوں کا تبختر ...... سب چیزوں کی حالت یہ تھی کہ دیکھتے ہی انسان کو بے اختیار ہنسی آ جائے مگر کس کی مجال تھی کہ ان کی طرف دیکھ کے مسکرا بھی دے انھوں نے کسی کو جھوٹوں مسکراتے دیکھا اور فوراً تمنچہ پر ہاتھ جا پڑا ——— نواب سعادت علی کے زمانہ میں ایک بانکے میرزا جہانگیر بیگ تھے۔ ان کی نوعمری کا زمانہ تھا۔ اب نواب صاحب کے درباریوں میں تھے۔ جہانگیر بیگ کی شوریدہ پشتی کی خبر کئی بار سن کر نواب صاحب خاموش رہے مگر آخرکار ایک دن بہت برہم ہوئے اور ان کے والد سے کہا۔

آپ کے صاحب زادے کی شورہ پشتیاں حد سے گزرتی جاتی ہیں۔ انھوں نے سارے شہر میں ادھم مچا رکھا ہے ان سے کہہ دیجیے گا کہ اپنے اس بانکپن پر نہ بھولیں۔ ناک نہ کٹوالی ہو تو علی سعادت علی خاں نہیں۔ باپ خود ہی بیٹے کی حرکتوں سے عاجز تھے —— گھر آئے اور بی بی سے کہا —— ماں نے کہا بیٹا خدا کے لئے اپنی حرکتیں چھوڑ دو تمہارے ابا بہت پریشان ہیں۔ مرزا صاحب نے کہا —— میرا کچھ قصور بھی بتایئے گا۔ —— باپ نے کہا کوئی ایک قصور ہو تو بتایا جائے —— آج نواب کہتے تھے کہ اپنے صاحبزادے سے کہہ دینا کہ میں سعادت علی خاں نہیں جو ناک نہ کٹوالی ہو۔

باپ سے اتنا سنتے ہی مرزا صاحب کو جو طیش آیا تو کمر سے پیش قبض نکال خود ہی اپنی ناک کاٹ کے باپ کی طرف پھینک دی اور بولے۔ بس اسی ناک کٹنے کی نواب صاحب دھمکی دیتے ہیں؟ لیجئے! یہ ناک انھیں لے جا کے دے دیجئے! یہ دیکھتے ہی ماں باپ دونوں سناٹے میں آگئے۔ اور جب باپ نے بیٹے کی ناک نذر کے طور پر نواب صاحب کے سامنے پیش کی تو وہ بھی دم بخود رہ گئے۔"

لکھنؤ کے اکثر بانکوں کی وضع یہ تھی کہ شربتی کے باریک انگرکھے کے سوا کوئی کپڑا نہ پہنتے اور لڑائی میں زرہ پہننا یا ڈھال سے کام لینا بزدلی خیال کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ حریف کا سامنا ہوتا تو اسکی تلوار کو گویا سینے پر لیتے۔

چرکے پر چرکے کھاتے اور اُف نہ کرتے۔ اسی طرح جیلوں کا جاڑا اسی شربتی کے انگرکھوں پر گزرتا اور کیا مجال کہ کانپیں تھرائیں یا سُو سُو کی آواز نکلے۔ بعض اس پر یہ قیامت کرتے کہ اس باریک لباس پر باسی پانی چھڑکواتے اور جوں جوں سردی معلوم ہوتی اور اکڑ جاتے۔"

اس طبقے کے علاوہ کچھ لوگوں نے سپہ گری کے فن کو پیشے کے طور پر اختیار کر رکھا تھا۔ ایک گروہ سپاہیوں کا تھا جو بضرورت اس کو استعمال کرتا تھا۔ ان کے علاوہ ہر شریف آدمی کے لئے مروجہ علوم کے ساتھ سپہ گری میں مہارت ہونا ضروری سمجھی جاتی تھی۔ شہزادے، نواب زادے۔ علماء۔ شعراء۔ اطباء سب ہی اس فن کے ماہر تھے خاص طور پر خاندان اجتہاد کے علماء اس میں غیر معمولی کمال رکھتے تھے سپاہیانہ جرأت ان کی سیرت و کردار کا جزو تھی۔ ہمارے سامنے کی بات ہے کہ شمس العلماء مولانا ابن حسن صاحب قبلہ کی ران میں ایک دنبل نکل آیا جو اندر ہی اندر بہت بڑھ گیا۔ ڈاکٹر مصر تھے کہ آپریشن بہت بڑا ہے بے ہوش کرنا ضروری ہے لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ گھر ہی پر اتنا بڑا آپریشن ہوا اور ان کی تیوریوں پر بل نہ پڑا۔ ان کے علاوہ ممتاز العلماء مولانا سید ابوالحسن صاحب صدق العلماء مولانا کلب حسین صاحب اور سید العلماء مولانا علی نقی صاحب فن سپہ گری میں غیر معمولی کمال رکھتے ہیں۔

اودھ کے علما و شعرا میں کوئی خاندان ایسا نہیں جس کے بیشتر افراد سپہ گری

کے فن سے واقف نہ ہوں۔ اور چھوٹے آغا صاحب تو جسمانی قوت
اور فنی مہارت میں بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ انگوٹھے سے مسل کے
روپیہ کے حروف مٹا دینا۔ بڑی بڑی ولدار سینیاں چٹکی سے پکڑ کے
چیر ڈالنا۔ کنکوا کھینچ کر دونوں کانیں ملا دینا۔ ہتھیلی پر پھول
رکھ کے گولی سے اڑا دینا ان کا ایک مشغلہ ہے جسے لوگ روز
اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ جیالے اتنے کہ ایک دفعہ چھبیس
ڈاکوؤں کے گروہ نے کاکوری کے راستہ میں گھیر لیا اور انھوں نے تنہا
مقابلہ کر کے انھیں بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ یہ چھوٹے آغا صاحب
پشتوں سے دولت و ثروت جاہ و حشمت کے مالک۔ اور ناز و نعم
میں پلے ہیں اور اس اعلیٰ تہذیب و معاشرت کی تمام نزاکتیں ان
میں موجود ہیں جو شرفائے لکھنؤ کا طرۂ امتیاز ہیں۔

آج بھی ہندوستان کے تمام شہروں سے زیادہ لکھنؤ کے
لوگوں میں سپاہیانہ آن بان موجود ہے جس کی تصدیق شیخ ممتاز حسین
صاحب اڈیٹر اودھ پنچ کے اس قول سے ہوتی ہے :-

"سن رسیدہ لوگوں میں پچانوے فیصدی بانک۔ پٹے۔ کشتی
بنوٹ کے ماہر موجود ہیں"۔[1]

یہی سپاہیانہ جوش اور امنگ جس کا مصرف باقی نہیں رہ گیا
تھا اس طرح ظاہر ہوئی کہ بجائے آدمی کے جانور لڑائے جانے لگے اور
ان کی خونریزی اور جانبازی کا تماشا دیکھا جانے لگا اور اس میں اتنی
ترقی ہوئی کہ شیر سے لے کے بھیڑ اور شاہین سے لے کے بٹیر تک کوئی

[1] اخبار اودھ پنچ بسلسلہ تنقید شعر الہند۔

جانور ایسا نہ تھا جس کو نہ لڑا ڈالا ہو۔ یہاں تک اونٹ جو لڑائی کے
لئے بہت ہی ناموزوں ہے اس کو بھی لڑوا کے چھوڑا۔ آج تک لکھنؤ
کے بے فکرے مختلف جانوروں کی لڑائی کا تماشا بڑی دلچسپی سے
دیکھتے ہیں۔

اگر یہ صحیح ہے کہ شاعر جن حالات سے دوچار رہتا ہے انہی کے
سانچے میں ڈھل کے اس کے خیالات شعر کی صورت اختیار کرتے ہیں
اس لئے ہر شاعر کا کلام گرد و پیش کے حالات کا آئینہ ہوتا ہے تو ان
شعرا کے کلام میں اس کی مثالیں ملیں گی جن کی زندگی کا کارواں انقلاب
کے دور سے گزرا ہے۔ مثال میں سودا کو لیجئے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں
سے دہلی کو لٹتے دیکھا تھا اور جب تک وہاں رہے شہر آشوب اور
شکایت روزگار ایسی نظمیں کہتے رہے ؎

[illegible] میں کیا عرض کروں اے حضرت
آرام سے کٹنے کی کوئی طرح بھی یاں ہے

[illegible] کا کہنے کہ خاموش ہی ہو جا
اس امر میں قاصر تو فرشتہ کی زباں ہے

[illegible] میں بتاؤں جو زمانہ کی ہے شکل
ہے وجہ معاش اپنی سو جس کا یہ بیاں ہے

[illegible] اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی
تنخواہ کا پھر عالم بالا یہ گماں ہے

[illegible] ہے سدا اپنی علف و دانہ کی خاطر
شمشیر جو گھر میں تو سپر بنئے کے یاں ہے

[illegible] کلا تو نہیں موزوں میں کچھ حال
تیروں میں ہے برگری تو ہے چلہ کماں ہے

[illegible] زادہ کو صراف سے جا کر
بی بی نے تو کچھ کھایا ہے فاقہ سے میاں ہے

یہ سن کے دیا کچھ تو ہوئی عید وگرنہ
شوال بھی پھر ماہ مبارک رمضاں ہے

یہی سودا لکھنؤ آ کے حسن برستا ہوا دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں

یہی سودا آصف الدولہ لڑائی جیت کے آتے ہیں تو یوں داد دیتے ہیں ؎

آیا عمل میں تیغ سے تیری وہ کارزار ‏— دیکھا جسے نہ ترک فلک نے بروزگار
گجنال مثل رعد کے گرجے تھی دمبدم ‏— آواز کرنال تھی طاؤس کی جھنکار

باروود گولہ توپ میں تھا بادہ یاد تھی
جس نے کہ قوم عاد اڑائی تھی جوں غبار

ان تاریخی بیانوں عینی مشاہدوں اور ذاتی تجربوں کے باوجود لکھنؤ کے تمدن میں کونسی ایسی بات نظر آتی ہے جسے معترض زنانہ پن کہتے ہیں غزل میں معشوق کے زنانہ اوصاف و لوازم کا ذکر جیسے چہرے کا نکھار۔ سینہ کا اُبھار۔ محرم کی چستی۔ سرمہ کا دنبالہ۔ مسّی کی دھڑی ۔ پازیب کی جھنکار

دوسرے محاوروں میں نرمی و نزاکت محاوروں میں ایک نرمی اور نزاکت ہے جسے لوگ زنانہ پن کہتے ہیں۔ یہ تہذیب کی بلندی ہے

تہذیب کی تعریف تہذیب کے معنی اگرچہ لغت میں خرمے کے درخت سے چھال کا ریشہ دور کرنے کے ہیں لیکن اصطلاح میں ناتراشیدگی اور بھدے پن کو دور کرنے کا نام تہذیب ہے جس چیز سے جتنا بھونڈا پن دور ہوتا جائے گا اتنی وہ نازک ہوتی جائے گی اور جب وہ اعلیٰ معیار پر پہونچ جاتی ہے تو معاشرہ کی ہر چیز میں نزاکت آجاتی ہے۔ مولانا شبلی نے ایک عمدہ مثال سے اس کو سمجھایا ہے وہ کہتے ہیں کہ ابتدائے تہذیب میں لونگ کی خوشبو پسند کی جاتی تھی۔ جتنی تہذیب ترقی کرتی گئی اتنی ہی ایسی چیزیں دماغ میں جھنجھناہٹ پیدا کرنے لگیں اور بیلے چنبیلی کی بھینی بھینی

خوشبو پسند کی جانے لگی اس سے ہر چیز پر قیاس کر لیجیے رفتار و گفتار۔ نشست و برخواست۔ الفاظ۔ لہجہ۔ اور ان سب کے ساتھ ادائے مطلب میں انتہائی باریکیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ میں نے اسی کتاب میں صفحہ ۴۴ کے حاشیہ پر یہ واقعہ لکھا ہے کہ میرے ہاتھ میں ہندی کا اخبار دیکھ کے ایک جگہ کے نہایت ذی علم صاحب اہل رئیس اور ایک لکھنؤ کے معمولی آدمی دونوں یہ پوچھنا چاہتے تھے کہ تم ہندی جانتے ہو یا نہیں۔ دوسری جگہ کے بزرگ اخبار کی طرف اشارہ کر کے یہ پوچھتے ہیں :-

"آپ اسے سمجھ لیتے ہیں"۔

اور لکھنوی یہ کہتے ہیں :-

"ماشاءاللہ ہندی سے بھی آپ کو ذوق ہے"۔

یہ استفسار نہیں بلکہ اظہار واقعہ کے طور پر کہا جا رہا ہے حالانکہ مقصد دونوں کا ایک ہی ہے مگر نہ جاننے کی نسبت دینا میری طرف اہل تہذیب کے خلاف سمجھے یہی وہ باریکیاں ہیں جو اہل لکھنؤ کی معاشرت میں ہیں اور اسی کو نزاکت کہا جاتا ہے۔

جب دہلی میں سکون و اطمینان کا دور اور تہذیب و تمدن کو عروج تھا اس وقت آس پاس کے دیہاتی دہلی والوں کو بھی نامرد اور زنانہ کہتے تھے۔ انشاءاللہ خاں نے دریائے لطافت میں اس کو یوں لکھا ہے :-

اہل مغل پورہ و سادات بارہہ باوصف تولد در دہلی صاحب اردو نیستند۔ چراکہ از زبان بدرو مادر و عم و خال و شوہر عمہ و صف وطن شریف باشندگان آنجا در شجاعت و سخاوت و مسافر

پروری و آقا پرستی و شناوری و بابر بزرگ در افتادن و
بجاہلانہ و بے ادبانہ روبروئے او حرف زدن و از فرط غرور
شجاعت سخن کسے گوش نہ کردن و متوجہ تصحیح الفاظ نہ گردیدن و
معترض را شمشیر نشان دادن و وضع عیاشیان شہر را از قبیل آرائش
بدن برخت باریک مشتمل بر گوشہ و کناری مذموم چون انشق و در بندش
دستار و رفتار و گفتار پیروی اسلاف کردن و تقلید خوش لباسان
پائے تخت را باعث انحراف از طریق نجابت انگاشتن می نمودند خود را در
ہر چیز مشابہ بجد و پدر شمرده خواہند داز ین کہ کسے بگوید کہ فلانے در صحبت
شاہجہان آبادیان حرف زدن و راه رفتن و دستار بستن را بر نسق
بزرگان خود فراموش کرده است و خشماً الحمد للہ کہ یک لفظ از ین
شہر بر زبان خود ندارید بسیار خوش می شوند و مصاحبت امراء و
خدمت سرکار شان عیب کلی پنداشتہ فوجداری رہتک و گوہانہ
و بڈھانہ و اندری و کڑھام و انبالہ و بانسی و حصار و ہودل
و پلول وغیرآں بگیرند۔ و در آنجا اہل مغل پورہ کسانے را کہ آبائے
شان از لاہور و پیشاور و کابل و غزنی و بلخ و بخارا و سمرقند آمده
اند خود شان کلاه پیشاوری کج بر سر گذاشتہ و یک چشم را بآن
پوشیده راه روند برادر را بھائی صاحب یا بھیا و بھائی جان
گفتن عیب پنداشتہ از آغا گفتن دست بر نہ دارند جمع کنند
و صاحبان بار بہر آدم شاہجہان آبادی را بیوفا و نامرد
و زنانہ پنداشتہ میران پور و مورنہ و کھتوره و جانسٹھ و کلکڑولی و

ٹڈلی را در پرگنہ آباد کنند و نان خمیری و زردک در گوشت گاو
بانسی بخورند و قریب دو صد حصہ برائے دیگر برادران نیز فرستند
ہر حصہ مشتمل بر یک پیالہ پر از دال ماش سیاه غیر مقشر کہ یک من
ہندی آن نیم سیر روغن داشتہ باشد با لحم البقر ہمیں کیفیت
و نان خمیری کہ نیم سیر در وزن باشد۔ بعد تناول طعام و شستن
دست۔ امیران دہلی را عیب کنند و گویند کہ امرائے ہندوستان
بر نیم سیر پلاؤ و بست روپیہ صرف می نمایند و تنہا در خلوت با بیگم یا
خانم یا لولی زہر ماری کنند۔ و یک دو لقمہ کہ از دولت ایشان
بیرون آید حق سارنگی نوازے یا قرم ساقے می شود برائے ہمیں
ہندوستان خراب شد

ایسے کھانے سے تو گو کھانا بہتر ہے

قول سید صاحب در باب خرابی ہندوستان انچہ میفرمایند مقرون
بصدق است لیکن بے سلیقگی را سلیقہ نمی تواں ساخت۔

(دریائے لطافت)

اس سے معلوم ہوا کہ زنانہ پن کے سمجھنے میں غلطی ہوئی لوگ دیہاتی
کو مردانہ پن اور تمدن کی نزاکتوں کو زنانہ پن سمجھتے ہیں حالانکہ حقیقت
... نرمی۔ سنجیدگی۔ باریکی۔ نفیس۔ خوبصورتی۔ اعلیٰ تہذیب تمدن۔
... ہیں۔ تہذیب و تمدن کا اثر زبان پر بھی پڑتا ہے۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں
... ملک ایک مدت تک ناز و نعم میں پلا ہو وہاں کے لوگوں کے جسم میں
نزاکت۔ حسن۔ اور لوچ ہو گا۔ اسی طرح ضرور ہے کہ ان کے
الفاظ میں لطافت نازکی اور شیرینی ہو [1]

[1] شعر العجم جلد پنجم ص ۷۷ تا ۷۸

اسی وقت ایک ایسی زبان بنتی ہے جو غزل کے لئے مناسب ہوتی ہے۔ مولانا شبلی شعرالعجم میں اس پر بہت اچھی بحث کی ہے وہ کہتے ہیں :–

الفاظ متعدد قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض نازک۔ لطیف شستہ۔ صاف۔ رواں۔ شیریں۔ بعض پرشوکت متین۔ بلند۔ پہلی قسم کے الفاظ عشق و محبت کے مضامین کے ادا کرنے کے لئے موزوں ہیں۔ عشق و محبت انسان کے لطیف اور نازک جذبات ہیں۔ اس لئے ان کے ادا کرنے کے لئے لفظ بھی اسی قسم کے ہونے چاہئیں۔ یہی بات ہے کہ قدما کی بہ نسبت متاخرین کی غزل اچھی ہوتی ہے ــــــ

ــــــ متاخرین یعنی کلیم، صائب وغیرہ کی نسبت یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ قصیدہ اچھا نہیں کہتے تھے اس کا سبب یہی ہے کہ ان کے زمانہ میں تمدن و معاشرت میں نزاکت پرستی آگئی اور عشقیہ جذبات عام ہو گئے تھے۔ اس کا اثر زبان پر بھی پڑا۔ یعنی زبان زیادہ نازک اور لطیف ہو گئی جو غزل کے لئے موزوں تھی۔

اگر غزل کو غزل کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس کی تعریف یہ ہے۔ "معشوق کی باتیں" "معشوق سے باتیں" ظاہر ہے کہ معشوق سے باتوں میں انتہائی فتادگی نیاز مندی اور نرمی کی ضرورت ہے۔ اور معشوق کی باتیں بھی کسی رزمیہ داستان کا بیان [illegible] اس لئے اس میں بڑی نرمی اور شیرینیٔ ادا کی ضرورت ہے [illegible] شبلی تحریر فرماتے ہیں :–

غزل کی ایک خاص زبان ہے جس میں نزاکت، لطافت، اور لوچ ہوتا ہے۔ شعرالعجم (ج ۵ – ص ۳۰)

غزل کی زبان کے اس لوچ اور نزاکت سے جو لوگ واقف [illegible] وہ اس کو زبان کا لطف سمجھتے ہیں۔ ایسی مثالوں سے دہلی والوں کا کلام بھی خالی نہیں ہے

[illegible] ہیں بانکی ادائیں تمھاری ادھر آؤ لے لوں بلائیں تمھاری

داغ

اگرچہ اس شعر کا لب و لہجہ اہل لکھنؤ کے نزدیک اوباشانہ ہے تاہم [illegible] کا لطف موجود ہے

وہ میرا چھیڑنا آغازِ الفت میں شکایت سے
وہ رکھ کر ہاتھ کانوں پر ترا کہنا کہ بھر پایا (داغ)

[illegible] قاتل سے یہ گلو میرا کمی جو مجھ سے کرے تو بہے لہو میرا

ذوق

[illegible] صدقے"۔ "میں قربان" "میری جان"۔ یہ سب اُن محاوروں [illegible] ہیں۔ جنھوں نے فارسی کو دنیا کی شیریں ترین زبان بنایا۔ ان [illegible] لطف وہی اٹھا سکتا ہے جس نے اس قند کو چکھا ہے۔ یہ ثابت کرنا [illegible] میں صدقے" میں زنانہ اور "قربانت شوم" میں مردانہ پن ہے [illegible] رہے"۔ "جاؤ بھی" "خدا کی مار" ایسے محاورے ہیں جو [illegible] سے لکھنؤ والوں نے سیکھے ہیں اور دہلی میں آج بھی بولے [illegible] اور یہی دونوں مقام وہ ہیں جنھوں نے پہلے پہل زنانی [illegible] میں فرق پیدا کیا اور آج تک یہ فرق موجود ہے ــــ [illegible] مرد اور مردانے محاورے عورتیں نہیں بولتیں۔ جب

جب اہل زبان ایسے محاورے بولیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ محاورے زنانے نہیں ہیں۔ چنانچہ اس زمانہ کے مشہور انشا پرداز راشد الخیری جو دہلی کے پرانے باشندے اور وہاں کی ڈیان لکھنے میں خاص شہرت رکھتے ہیں۔ (اپنے ایک مضمون (چاندنی چوک کا جنازہ) میں دہلی کے دو شخصوں کی گفتگو لکھتے ہیں۔ ایک میر صاحب ہیں دوسرے مرزا صاحب۔ مرزا صاحب دہلی کی پرانی چہل پہل کا ذکر کرتے ہیں تو میر صاحب کہتے ہیں۔

اے ہے مرزا صاحب کلیجہ پر سانپ لوٹ گیا۔ شہر کی آبادی کا سماں آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ کیا چہل پہل تھی ——— خدا کی مار ایسی ترقی کو پھلوا سے لالوں کو پری وش مہ جمالوں کو فاقوں میں تڑپتے دیکھا۔

ایسے محاوروں سے زنانہ پن محسوس کرنا زبان سے ناواقفیت اور تہذیب و تمدن سے اجنبیت کی دلیل ہے۔

دوسری چیز زنانہ پن کے ثبوت میں بڑی بلند آہنگی سے یہ پیش کی جاتی ہے کہ لکھنؤ والے معشوق حقیقی کے بجائے معشوق مجازی اور اس کے زنانہ خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں جیسے انگیا۔ کرتی [illegible] مسی۔ کنگھی چوٹی وغیرہ۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عورت سے رغبت اور اس کی خصوصیات سے قلبی کشش ظاہر کرنا اگر زنانہ پن ہے تو مردانہ پن کیا ہے؟

اس زمانہ کے مشہور انشا پرداز حضرت نیاز فتحپوری نے غزل کی یہ تعریف کی ہے:-

لفظ "غزل" کے معنی اس قدر عام ہو چکے ہیں کہ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ جس نے محبت کی ہے اسے تو خیر جاننا ہی چاہیئے۔ لیکن جو اس کوچہ سے نابلد ہے اس کو بھی سماعی یا قیاسی طور پر معلوم ہوگا۔ محبوب سے باتیں کرنے کا نام "غزل و تغزل یا مغازلہ ہے۔ اگر یہ گفتگو باہمدگر ہو" - اب غور طلب یہ امر ہے کہ محبوب سے ایک عاشق کیا باتیں کر سکتا ہے اور ان باتوں کا انداز و لب و لہجہ کیا ہونا چاہیئے"۔

محبت یا عشق فی الحقیقت ایک شدید قسم کا احساس پسندیدگی ہے ——— پھر اگر یہی جذبہ پسندیدگی افراد نوع انسانی میں سے کسی کے ساتھ ہو تو وہ بھی محبت کہلاتا ہے لیکن جس محبت کا تعلق غزل گوئی سے ہے وہ مخصوص ہے۔ اس جذبہ سے جو جنسی کشش و خواہش سے پیدا ہوتا ہے محبت۔ ماں، باپ، بھائی، اولاد، اعزا و احباب سے بھی ہوتی ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی غزل کا موضوع نہیں اس کا تعلق صرف ایسی فرد سے ہوتا ہے جس سے انسان میں جنسی ہیجان پیدا ہو سکتا ہے۔ بعض احباب کو میں نے کہتے ہوئے سنا ہے کہ علاوہ جنسی محبت کے ایک چیز ذہنی و روحانی محبت بھی ہے جسے (PLATONIC LOVE) کہتے ہیں لیکن میں اس کو محض شاعری سمجھتا ہوں اور اس کا وجود جنسی کیفیت سے علیحدہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تاہم اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ اس عنقا کا وجود ممکن ہے تو بھی اس

کا غزل گوئی سے کوئی واسطہ نہیں۔ الغرض تغزل کا تعلق
میرے نزدیک صرف ان جذبات محبت سے ہے جو اس
گوشت و پوشت کی دنیا میں گوشت پوشت سے پیدا ہوتے
ہیں اور جن کے پورے ہونے کی تمنا ہر محبت کرنے والے کو
ہوتی ہے۔

انتقادیات حصہ دوم (صفحہ ۱۶۱ تا ۱۶۳)

اس تعریف کے بعد عورت کو معشوق قرار دینا اور اس کے عشق
کی داستان بیان کرنا ہی غزل ہے اس کے علاوہ یہ بھی دیکھئے کہ
عورت سے محبت کا اظہار اردو شاعری میں عیب نہیں نہ اس پر
کسی کو اعتراض ہے۔ مثنوی کا وجود اس کا زندہ گواہ ہے۔ جب یہ
چیز سوسائٹی میں عیب نہیں تو غزل جس کو اب اتنی وسعت حاصل
ہو چکی ہے کہ سائنس کے حقائق فلسفہ کے دقائق تصوف کے مسائل
حکمت کے مسائل۔ وطن۔ قوم۔ مذہب۔ سیاسیات۔ اقتصادیات
غرض وہ کونسی بات ہے جو غزل کا موضوع نہ ہو تو پھر عورت نے
کیا قصور کیا ہے؟ اب رہے اس کے اوصاف اگر ان میں ہاتھ نہ
لگایا جائے تو عشقیہ شاعری کا وجود نہ رہ جائے۔ اس لئے کہ
اگر خال مشکیں اور زلف دراز کا ذکر نہ کیا جائے تو غمزہ و ناز کا کیا
ہو اور جب اس کو بھی چھوڑ دیا جائے تو پھر وہی سبزہ خط باقی
رہ جاتا ہے جو دہلی کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے۔ اور چونکہ لکھنؤ
میں عورتوں سے محبت کی جاتی تھی اور امارد سے دلچسپی یہاں
کی سوسائٹی میں ایک بہت بڑا اخلاقی گناہ تھا لہٰذا اس سبزہ کو یہاں
کی آب و ہوا راس نہیں آسکتی تھی لازماً زنانہ اوصاف کا ذکر کیا
جاتا ہے۔ متقدمین دہلی کے یہاں بھی یہ شراب کھنچ چکی ہے اگر لکھنؤ

والوں نے اسے دو آتشہ کر دیا تو کیا گناہ ہوا۔

دوسرا اعتراض اور اس کا جواب

لکھنؤ کی زبان پر دوسرا اعتراض
فارسیت کے غلبہ کا ہے جس کی
تفصیل یوں کی جاتی ہے کہ لکھنؤ میں پہلے دہلی کی زبان بولی جاتی تھی
ناسخ نے اپنی اصلاحوں سے تنگ کر کے ایک خاص زبان بنا دی
اور اصلاح کی دھن میں بہت سی اصلی لفظیں نکال کر عربی فارسی لفظیں
کثرت سے داخل کر لیں۔ آتش اور انیس و دبیر اس کو سمجھ رہے
تھے اس لیے ان لوگوں نے ان کی اصلاحوں کو قبول نہیں کیا اور
پرانے محاورے اور ترکیبیں نہیں چھوڑیں۔ میر انیس اکثر موقعوں پر
کہہ دیا کرتے تھے کہ "یہ میرے گھرانے کی زبان ہے"۔

متروکات کی بحث

واقعہ یہ ہے کہ ناسخ نے جو لفظیں اور ترکیبیں
ناپسند کیں ان کی اصلاح کر دی یا انھیں
ترک کر دیا۔ متروک لفظوں کی جگہ کوئی نئی لفظ اختیار نہیں کی بلکہ
ان معنوں میں جو فصیح لفظ زبان میں مستعمل تھی اس کو اختیار کر
لیا اس طرح غیر ضروری یا ضرورت سے زیادہ لفظوں کے نکل جانے
سے زبان تنگ نہیں ہوئی اور صفائی آگئی۔ ہر زبان میں یہی ہوتا
آیا ہے۔ ہمارا ذوق آج بھی مستعمل اور متروک لفظوں کی لطافت
میں فرق محسوس کرتا ہے۔ خوردہ اوستا کا ایک فقرہ ہے۔

خرد ہمند اروند اسپ
خرد مند قوی

یہ اوستا کا "ہمند" آج "مند" اور یقیناً پہلے سے سبک
اور شیریں ہے۔

فارسی پر وسیع نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس میں بہت سی لفظیں صدیوں سے متروک اور بہت سی اصلاحی صورت میں موجود ہیں مثلاً :-

پلوده	بمعنی کہنہ و بوسیده
پسوون	بمعنی دست زدن و دست مالیدن
پدرام	بمعنی آراستہ و خوش و خرّم

آج متروک ہے اور

چدن	سے	چیدن
سیتہیدن	سے	ستیزیدن
برسان	سے	بسان
ماہار	سے	مہار

اصلاحی صورت میں موجود ہے - فردوسی کے شاہنامہ سے ایسی بہت سی لفظیں چھانٹی جا سکتی ہیں جن کو آج کی زبان برداشت نہیں کر سکتی - نظم میں اصلاح کی ضرورت اور بڑھ جاتی ہے کیونکہ اس کی ابتداء لفظوں کو مسخ کرنے سے ہوتی ہے پہلے دور کے شاعروں کی پوری توجہ صرف نظم کر لینے کی طرف ہوتی ہے جس میں زبان کی صحت کا خیال نہیں رہتا - لفظوں کو بگاڑ کے مشدد کو غیر مشدد ساکن کو متحرک ، کبھی کوئی حرف بڑھا کے کبھی گھٹا کے مصرع موزوں کر لیتے اور اسی کو کمال سمجھتے تھے لیکن شاعری کی ترقی کے ساتھ لفظوں اور ترکیبوں کا بھدا پن محسوس ہوتا جاتا ہے اور زبان کی اصلاح ہوتی رہتی ہے - آگے چل کے فصاحت کا ایک معیار بن

فارسی میں دورِ اول کے شعراء فیروز مشرقی - ابوالحسن رودکی منوچہری دامغانی کے یہاں "ابلاه" "چار" "ہرگز" بجائے ابلہ چاره ہرگز کے موجود ہے

فارسی میں تشدید نہیں ہے لیکن شعری ضرورت سے وہ بھی لے لی گئی اور غیر مشدد کو مشدد کر کے مصرع موزوں کیا گیا - رودکی کہتا

ایران میں اسلام سے پہلے تین طرح کے خط مروج تھے -

(۱) خط مصور (۲) خط میخی (۳) خط پہلوی

خط مصور میں جانوروں کی تصویریں حروف تہجی کا کام دیتی تھیں -

خط میخی کیلوں سے اور پہلوی یونانی خط سے مشابہ تھا ان تینوں قسموں کے خطوں میں جن حرفوں کا تلفظ مکرر ہے وہ کتابت میں بھی مکرر لکھے جاتے تھے - ایک حرف لکھ کر دو مرتبہ پڑھنا ادغام عرب سے مخصوص اور وہ عبرانی سے ماخوذ ہے - عبرانی میں اس کو قبوص کہتے ہیں -

خرّم - شکّر - فرّخ - نقارہ بیشک فارسی میں مروج ہے - خرّم مرکب ہے اور اس کا تلفظ خرم - (بضم ا و خرّم (بکسر را) ہے - خُر (بضم) بمعنی آفتاب اور رم - رفتار اور خرم بمعنی خوشی و خوشحالی - خرّم کے معنی ہیں - آفتاب رفتار کے معنی ہیں خوش رفتار یا خوشی کی رفتار - اسی طرح فرّخ فر اور رخ سے فر کے معنی ہیں مبارک اور زیبا رخ (چہره) مبارک و زیبا رخ - البتہ - شکر - تخفیف اور تشدید دونوں

ہے ۵

موز بجائے سوسن آمد باز — مئے بجائے ارغواں آمد

اگر آج کوئی ایسا کرے تو لوگ ہنسیں۔ لیکن اس وقت یہ
شعر خراج تحسین حاصل کرتا ہوگا۔ ہر چیز ابتدا میں ایسی ہی ہوتی
ہے جتنا جتنا زمانہ گزرتا جاتا ہے۔ اس میں تراش، خراش اور
نفاست کام کرتی جاتی ہے۔ فارسی اگرچہ ترقی یافتہ زبان تھی مگر اس
بھی جب شاعری شروع ہوئی تو ضرورت پر صحیح لفظ کو غلط اور خوشنما
کو بدنما کرکے مصرع موزوں کیا گیا۔ اردو بھی کی ترقی یافتہ نہ تھی
اس کی بہت سی لفظیں اور ترکیبیں پہلے ہی سے بھونڈی اور بھدی
تھیں کیونکہ زبان کی ابتدا عوام سے ہوتی ہے اور وہ الفاظ
کو خوبصورت بنانے کا سلیقہ نہیں رکھتے۔ خواص انھیں ا
زبان کو درست کرکے مہذب بناتے ہیں۔ اردو کی بھی ابتدا
میں یہی حالت تھی۔ اس لئے شعراء کو اس کی لفظوں اور ترکیبوں
کے سنوارنے میں بڑی محنت کرنا پڑی کبھی ایک معنی کے لئے کئی
لفظیں مستعمل تھیں تو ان میں سے اپنے ذوق اور زبان کی ساخت
کے موافق چھانٹ کے فصیح لفظیں رکھ لیں اور غیر فصیح ترک
کردیں۔ کبھی غیر فصیح لفظ کو کاٹ چھانٹ کر فصیح بنالیا۔ اس

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ

کے ساتھ مستعمل ہے۔ ممکن ہے کہ اس میں تشدید عربوں کے غلبے کے بعد
داخل ہوئی کیونکہ وہ شکر کو شُکّر کہتے ہیں۔ نقّارا یونانی ہے۔ نک آرا
نک بمعنی فتح۔ آرا بمعنی قریب اس میں کوئی حرف مکرر نہیں ہے۔ اس
تلفظ نقّارا بھی عربوں کا اثر ہے ورنہ اصل نقارا تخفیف ہے

زبان منجھتی اور صاف ہوتی رہی۔ دہلی والوں کے بعد یہی خدمت
لکھنؤ والوں نے انجام دی۔ مولوی حکیم عبدالحئی مرحوم لکھتے ہیں

دراوّل سب سے پہلا کارنامہ اس دور کے شعراء کا یہ
ہے کہ زبان کی صفائی اور صحت میں پوری کوشش
کی اور بہت سے الفاظ و روابط جنھیں ولی اور ان کے ہمعصر
بے تکلف کام میں لاتے تھے نکال ڈالے۔ تاہم کچھ الفاظ
ایسے رہ گئے جو ان کے زمانہ میں فصیح سمجھے جاتے ہوں مگر آج
ہم کو اجنبی اور نامانوس معلوم ہوتے ہیں مثلاً کیا گیا بجائے
کس کس اون نے جن نے بجائے اس نے جس نے بجز [illegible] بجائے
نظر بھر کے دل اپنے بجائے اپنے دل مجھ آنسو بجائے مرے آنسو
ایدھر اودھر بجائے اِدھر اُدھر کہنے لاگا کے بجائے کہنے لگا
دوانہ بگانہ بجائے دیوانہ بیگانہ۔ رقیباں بجائے رقیبوں کے
انکھڑیاں بلفظ آنکھوں کی جگہ، سجن معشوق کے معنوں میں
اندر کے معنوں میں دم کھا رہو۔ سانس نہ لو یعنی چپکے ہو
رہو۔ آپ ہیں ناہیں، میں کہا۔ میں نے کہا۔ اسی طرح کے اور
چند الفاظ ہیں جو زیادہ تتبع سے مل سکتے ہیں۔ تاہم زبان
کو صاف اور ستھرا کرنے میں اس دور کے شعراء نے جو کوششیں
کیں وہ نہایت قابل قدر ہیں ۔

انکھڑیاں اب بھی مستعمل ہے ۵

نشیلی انکھڑیاں ساقی کی زاہد سے بھی کہہ اٹھیں
یہ پہلا روز فردوس کا ہے پی جام صہبائی (عزیز)

دور دوم سب سے نمایاں کارنامہ اس دور کے شعراء کا یہ ہے کہ انھوں نے زبان کی صحت اور صفائی میں ایک قدم اور آگے بڑھایا اور بہت سے ناگوار الفاظ و روابط جن کو دور اول کے شعراء نے قدماء سے ترکہ میں پایا تھا انھوں نے نکال ڈالے اور وہ ایک حد تک صاف و شستہ ہو گئی تاہم الکھڑیاں جھکڑا[1] مکھڑا، اَلک، نت[2]، زور آتیاں جاتیاں، جاؤں ہوں، آؤں ہوں، کھینچوں ہوں، اپنے سے کہتا تھا، ایدھر، اودھر تسپر کئے اور اسی قسم کے اور الفاظ باقی رہ گئے تھے۔

دور سوم ان لوگوں کا سب سے بڑا کارنامہ زبان کی اصلاح اور درستی ہے جو نامانوس الفاظ دور دوم تک باقی رہ گئے تھے اُن کو انھوں نے دور کر کے روزمرہ اور محاوروں کے ساتھ فارسی ترکیبوں کی نہایت لطیف اور خوشنما ترکیبوں سے اردو میں شیرینی اور گھلاوٹ پیدا کر دی جو دیکھنے کے قابل ہے

ان کے کلام میں آتیاں۔ جاتیاں۔ ٹلک۔ نت اور بعض جگہ الکھڑی اکھڑی بندشیں ہیں

---

[1] جھکڑا۔ مکھڑا۔ نت نئی اب بھی مروج ہے ؎

نکھرے گا رنگ چہرہ مہرہ درست ہو کر
یہ زرد زرد مکھڑا نکھرہ ہو گا زعفرانی (صفی)

[2] گل رعنا صفحہ ۲۵

کسو۔ کبھو۔ تئیں۔ ان کے بسمیت۔ مت۔ آئے ہے جائے ہے۔ دیکھیو۔ کیجیو۔ بھیجیو۔ ورے۔ پرے۔ پنہانا[1]۔ بٹھانا تنگ۔ سدا[2] بمعنی ہمیشہ۔ روز بمعنی عجیب یا نہایت۔ بہت بے تکلفی سے کلام میں لائے گئے ہیں[3]

طبقہ متاخرین میں شعرائے لکھنؤ کے متعلق لکھتے ہیں:۔
اس طبقہ کو میں نے تین دوروں پر تقسیم کیا ہے۔ دور اول ناسخ و آتش اور ان کے متبعین کا۔

---

[1] پنہانا بٹھانا اب بھی مستعمل ہے ؎

پنہایا جب حبیب کبریا نے اپنا پیرہن بلا گرداں ہوئے ادریس باغ خلد کر (عزیز)

کہیں کیوں منہ سے ہم خود دیکھ لینگے دیکھنے والے
مقابل حضرت عیسیٰ کے ہم تم کو بٹھا دیں گے (عزیز)

[2] سدا لکھنؤ میں اب بھی مروج ہے ؎

ہماؤں ہو مجھے رنگیں نوائی مدح مولا میں
مبارک تجھ کو اے حاسد سدا خونابہ افشانی (عزیز)

ہماری زبان کے مورخوں نے متروکات کی تلاش میں دقت نظر سے کام نہیں لیا بہت سی مستعمل لفظیں متروکات کی فہرست میں داخل کر دیں مثلاً درشن کو تمام تذکروں میں متروک لکھا ہے۔ دور جافر کے استاد کامل مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کا شعر ہے ؎

بدلی وہ چھٹی وہ چاند چمکا درشن کرنے کو شکر اکا

[3] گل رعنا صفحہ ۲۵

دور اول

دور اول کے شعرا کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے زبان میں تراش خراش کر کے بد مزہ اور ناگوار الفاظ کو نکال دیا جو مذاق سلیم میں گراں اور ثقیل معلوم ہوتے تھے مثلاً "آئے ہے" جلائے ہے۔ کہوے ہے۔ دون ہوں۔ لوں ہوں۔ ٹک۔ نت۔ کبھو۔ کسو۔ تئیں۔ آن کے۔ سمیت۔ مت زور بمعنی بہت یا عجیب یا جمع مونث کے معنوں کو الف نون کے ساتھ آتیاں جاتیاں۔ اسی طرح موصوف جمع ہو اور صفت ہندی ہو تو موصوف کی مناسبت سے صفت کو جمع بولنا جیسے بھاریاں [1]"

یہ ہیں وہ اصلاحیں جو پہلے دہلی والوں نے پھر لکھنؤ والوں نے کیں۔ اگر یہ عمل زبان کو معیار سے گرا دیتا ہے تو اردو پہلے ہی سے معیاری نہیں تھی۔ اس لئے کہ بالکل ویسی ہی تبدیلیاں لکھنؤ میں ہوئیں جیسی دہلی میں اس سے پہلے ہو چکی تھیں مثلاً "نین" اور "چشم" دونوں لفظیں دہلی میں مستعمل تھیں نین کو غیر فصیح سمجھ کر ترک کر دیا چشم کو باقی رکھا۔ اسی طرح

نمن　　طرح　　بھیتر　　اندر
پگ　　پگڑی　　باٹ　　رستہ
کدھیں　　کبھو

ہم معنی لفظیں مستعمل تھیں اصلاح میں پہلی سب لفظیں

[1] گل رعنا ص ۶۳

پگ۔ کدھین۔ بھیتر۔ باٹ خارج ہوئیں اور طرح۔ پگڑی کبھو۔ اندر۔ رستہ باقی ہیں۔ ترکیبی اصلاحیں یہ ہیں:-

قدیم ترکیب	اصلاحی ترکیب
نغمہ بولنا	نغمہ کرنا
ان سوا	ان کے سوا
جن کن اچھے	جن کے پاس ہے
جنھوں آگے	جنھوں کے آگے
تجھ بھوان	تجھ بھوون
سرخرویاں	سرخرویوں
جالے	جلائے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی والوں نے اپنے ذوق کے فتوے سے بھونڈی لفظ بھدی ترکیب ترک کر کے خوشنما لفظ سبک ترکیب اختیار کی۔ یہی اصول اہل لکھنؤ کے پیش نظر تھا۔ یعنی جو بھونڈی لفظیں بھدی ترکیبیں دہلی والوں کی زبان پر باقی رہ گئی تھیں۔ انھیں یا ترک کر دیا یا خوشنما بنا دیا۔ مثلاً جنھوں آگے دہلی والوں نے غیر فصیح سمجھ کے "جنھوں کے آگے" بنایا۔ اہل لکھنؤ نے اس میں بھی بھدا پن محسوس کر کے جن کے آگے بنایا۔ اسی طرح تجھ بھوان کو دہلی والوں نے تجھ بھوون بنایا لکھنؤ والوں نے تیری بھوئیں کر دیا۔ لکھنؤ کی یہ اصلاحیں ٹھیک ہیں یا نہیں اس کا فیصلہ ہم ذوق سلیم پر چھوڑتے ہیں۔ اگرچہ انہیں دونوں مثالوں سے زبان کی تدریجی ترقی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہم کچھ مثالیں اور پیش کرتے ہیں۔

دہلی کی ترکیب	لکھنؤ کی اصلاحیں
پھرے ہے کرے ہے آئے ہے وغیرہ	پھرتا ہے۔ کرتا ہے، آتا ہے وغیرہ
انکھڑیاں ملیاں	انکھڑیاں ملیں۔ آنکھیں ملیں
آتیاں ہیں جاتیاں ہیں وغیرہ	آتی ہیں۔ جاتی ہیں وغیرہ
اون نے	اس نے
بغل بیچ	بغل میں
اس کے گئے	اس کے جانے کے بعد
وہ جدی چیز ہے	وہ اور چیز ہے۔ وہ جدا چیز ہے
ہلاکی کو پہونچنا	ہلاکت کو پہونچنا
پلک ماروں ہوں	پلک مارتا ہوں

ان اصلاحوں سے یہ ظاہر ہو گیا کہ ولی کے زمانہ سے میر و سودا کے زمانہ تک زبان کی اصلاح کا جو اصول دہلی والوں کے سامنے تھا وہی میر و سودا کی زبان میں اصلاح کے وقت ناسخ کے پیش نظر تھا۔ یہ خیال غلط ہے کہ ناسخ نے جب کوئی لفظ ترک کی تو اس کی جگہ غیر زبان کی لفظ اختیار کی۔ متروکات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لفظ ان کے ذوق پر گراں تھی اس کوکی قائم مقام جو فصیح لفظ زبان میں مستعمل تھی اس کو اختیار کر لیا چاہے وہ کسی زبان کی ہو لیکن ہم معترض کے اس کلیہ کو باطل کرنے کے لئے چند مثالیں ایسی بھی پیش کرتے ہیں جن میں غیر زبان کی لفظیں استعمال نہیں ہوئیں

ناسخ کے متروکات	ناسخ کے مستعملات
پرے	الگ
رپٹے ہے	پھسلتا ہے
دامن چلنا	دامن مسکنا
بیچ	میں
اس کنے	اس کے پاس
قاصد چلانا	قاصد بھیجنا
جہاں تہاں	کہیں کہیں۔ ادھر اُدھر
تب، نپٹ	جب بہت

عہد بعید کی زبان اور اُس کی تدریجی ترقی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ متروکات سے زبان صاف ہوتی رہی۔ دور اول کی ادبی زبان یہ تھی:

اے ساجن جن تیرے مجھ کون یہ گھر بار کیا کرنا۔ اگر تو مجھ کن
(معشوق بے — کو — میرے پاس)

نا اچھے تو یہ سنسار کیا کرنا۔ تمنا کے من میں اول جب سون
(نہیں ہے — دنیا — تمہارے جی میں — سے)

آنے کی منشا نہ تھی تو پھر مجھ دکھ بھرے سوں جھٹا اقرار کیا کرنا۔ مجھ
(سے جھوٹا — میرا)

دل جس کوں اچھے اوس ساجن سیتی دوجا ظالم۔ جگ بھتر نا اچھے۔
(دل میرے پاس، — معشوق سا — دوسرا — دنیا — نہیں ہے)

کرھیں۔ مجھ انکھیاں کا انجھواں نا تھمے۔
کبھی میری آنکھوں کا آنسو

متوسطین کا دور دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے پہلا میر و سودا دوسرا مصحفی و انشا کا۔ میر و سودا کے زمانہ کی ادبی زبان یہ تھی:—

جب سے اون نے انکھڑیاں مجھ سے ملائیاں مجھ دل اوپر
اس نے آنکھیں مجھ سے ملائیں
اک تیر لاگا۔ لے صبح تا شام دل کے تئیں چین نہیں
آئے ہے۔

مصحفی و انشاء کے دور کی زبان یہ تھی:۔

میں دم بہ دم کیوں نہ رؤوں دل سے نت لہو بہتا رہتا ہے
میں اس کو دل دیا تس پر بھی وہ زخمیں لگائے جاتا ہے
میں اُس کی خاطر کوہ تک چیرا ہوں تس پر بھی وہ ہوا خواہوں
میں نہیں گنے ہے۔ اُس محسن میری زاریاں اس کا دل سہے
ہے سلہ

یہ ہے دہلی کی اس ترقی یافتہ زبان کا آخری نمونہ جو میر و سودا مصحفی و انشاء سے لکھنؤ والوں کو ملی اُس کو انھوں نے یوں درست کیا۔

میں ہر دم کیونکر نہ روؤں دل سے ہمیشہ لہو بہتا رہتا ہے
میں نے اُس کو دل دیدیا اس پر بھی وہ زخم لگائے جاتا ہے۔

سلہ نثر کے یہ تینوں ولی۔ میر اور مصحفی کے اشعار کے ہیں۔ ۱۲

میں نے اُس کے لئے پہاڑ تک کاٹا اس پر بھی وہ ہوا خواہوں میں نہیں گنتا۔

ہم نے دونوں جگہ کی زبان کو آمنے سامنے رکھ دیا۔ اب لکھنؤ والوں نے ترقی دی یا نہیں۔ اس کا فیصلہ اہل ذوق کے لئے آسان ہے کہا جاتا ہے کہ عام لفظیں جو اردو میں موجود تھیں ان کی جگہ بھی عربی فارسی لفظیں استعمال ہوئیں۔ مگر اس سے یہ کیونکر ثابت ہو سکتا ہے کہ ان کی مرادف لفظیں خارج ہو گئیں۔ جو اس طرز عمل کا مخالف ہو وہ اپنی ہی زبان کی لفظیں استعمال کرے اور ماہرین زبان نے ایسا کیا بھی ہے۔ حضرت آرزو کی خالص اردو اس کی زندہ مثال ہے لیکن لکھنؤ کی زبان میں فارسیت کا عنصر غالب بتانا بھی حقیقت پر مبنی نہیں۔ اردو نثر کی وہ کتابیں جو دہلی اور لکھنؤ میں ایک ہی زمانے میں لکھی گئی ہیں ان کا مقابلہ میرے بیان کی تائید کرے گا۔ اور اگر نظم کے سرمایہ کو بھی لے لیا جائے تو فارسیت کے غلبہ میں دہلی کا پلہ بھاری ہو جائے گا۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو میں میر و سودا کے زمانہ میں فارسی لفظوں کے استعمال کے متعلق لکھتے ہیں:

"اس عہد میں فارسیت کا بہت غلبہ تھا میر و سودا اور دیگر استادان فن اپنے پیش رووں کی نقل کرتے رہے شاہ حاتم کے ساتھ خواجہ میر درد میر جاں تمکین نے اپنے کلام سے ہندی الفاظ نکال ڈالے ——— مولوی عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں کہ ان اصلاحات کے بعد اردو شاعری بالکل فارسی کے قالب میں ڈھل گئی۔ اور ہمارے شعراء نے بالکل ایرانی شعراء کے طرز میں

اس کے برعکس ناسخ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے الفاظ کے صرف میں ایسا کمال دکھایا جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ عربی فارسی اردو لفظوں کی باہمی ترکیب اور ان کی مجموعی ہیئت سے اردویت پیدا کی جس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں پیش کی جا چکی ہے۔

معترضین کی یہ ستم ظریفی دیکھنے کے قابل ہے کہ دہلی جہاں کی زبان میں عربی فارسی لفظیں اتنی اور اس طرح ملا دی گئیں کہ اردو فارسی بن گئی وہاں کی زبان خالص اور مستند ہے لیکن جہاں فارسی اردو بن گئی وہاں کی زبان مستند نہیں۔

جنوں کا نام خرد پڑ گیا خرد کا جنوں

حقیقت یہ ہے کہ لکھنؤ کی زبان میں عربی فارسی لفظیں اُسی نسبت سے ملیں گی جس نسبت سے دہلی کی زبان میں پائی جاتی ہیں اور لکھنؤ میں بھی وہی لوگ اردو کے ماہر سمجھے جاتے ہیں جن کو اردو لفظوں اور محاوروں کے استعمال پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ لکھنؤ کی زبان سے ہمارا مقصود یہی چیز ہے اور اسی کی تقلید ضروری بتائی جاتی ہے ورنہ عربی فارسی لفظوں کے استعمال میں جو درجہ اہل لکھنؤ کو حاصل ہے وہی دوسرے شہر والوں کو ہم ہرگز اسکے حامی نہیں کہ فارسی لفظوں کے استعمال میں اہل لکھنؤ کی تقلید کی جائے۔ اگر وہ عربی فارسی لفظیں زیادہ استعمال کرتے ہیں تو برا کرتے ہیں اور اس میں ہرگز لائق تقلید نہیں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ لکھنؤ والوں نے زبان کو جو ترقی دی

وہ اردو لفظوں کے انفرادی اور ترکیبی اصلاح و استعمال کے ذریعے یہی ان کا طرۂ امتیاز ہے اور اسی کی تقلید ضروری ہے۔

آتش اور انیس اور دبیر کی زبان

کہا جاتا ہے کہ آتش اور انیس و دبیر کے کلام میں ایسے محاورے اور لفظیں موجود ہیں جو دہلی میں مستعمل اور لکھنؤ میں متروک ہیں۔

لیکن یہ سمجھنا چاہیئے کہ متروک لفظیں رفتہ رفتہ ترک ہوئیں۔ سب اکٹھا نہ ترک ہوئیں نہ ہو سکتی تھیں لہٰذا اگر کسی کے کلام میں کوئی ایسی لفظ مل جائے جو ترک ہونے سے پہلے استعمال ہوئی ہو تو سند یا مثال میں پیش کرنا صحیح نہیں ناسخ کا شعر ہے ؎

عابد و زاہد چلے جاتے ہیں پینا شراب
اب تو ناسخ زور رند لا ابالی ہو گیا

"زور" بہت کے معنوں میں ناسخ نے متروک قرار دیا اور خود ان ہی کے یہاں موجود ہے۔ مگر ایک ہی جگہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کا ابتدائی کلام ہے۔ اس زمانے کے اور شاعروں کے یہاں بھی ایسی لفظیں بہت ہیں اس سے ان کا خاندانی اور لسانی رشتہ دہلی سے قائم کرنا شاعرانہ نکتہ آفرینی کے سوا اور کچھ نہیں۔ ایسی لفظیں ان شاعروں کے یہاں بھی ملیں گی جن کو دہلی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جیسے ابھی ناسخ کا شعر پیش کیا اس کے علاوہ بھی بہت سے شاعر ایسے ملیں گے جن کے ابتدائی کلام میں ایسی لفظیں

موجود ہیں اور وہ اپنا تعلق لکھنؤ سے ظاہر کرتے تھے اور وہاں کے تمدن و معاشرت اور زبان پر ناز کرتے تھے۔ لکھنؤ کے مشہور شاعر نواب سید محمد خان رند کہتے ہیں ؎

رند کھل جاتا ہے یاں کھوٹے کھرے کا پردہ
لکھنؤ اہل ہنر کے لئے ٹکسال ہے آج

اسی کے ساتھ ان کے دیوان میں یہ دو مصرعے بھی موجود ہیں ؎

ع۔ بڑے مجنوں کے جنگل سے بھی کوسوں وہ بیاباں تھا

ع۔ منتیں مانیاں درگاہوں میں چھلّے باندھے

خود انیس کی زندگی کے واقعات پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ ان کو دہلی کے تعلق کا احساس ذرا بھی نہ تھا۔ اور لکھنؤ پر فریفتہ تھے۔ حیدرآباد میں ان کا سر منبر کہنا کہ ہائے لکھنؤ تجھے کہاں سے لاؤں ۱؎ اور مرثیوں میں جابجا لکھنؤ کی تعریف جس جوش سے کی ہے اس سے اسکی تصدیق ہوتی ہے۔ نہیں معلوم مولانا شبلی نے کس علم و یقین پر لکھ دیا کہ جو لوگ اپنے تئیں "دہلی کی طرف منسوب کرتے تھے وہ ان الفاظ و محاورات کو وطن کی یادگار سمجھتے تھے ۲؎ اگرچہ اس موقع پر انھوں نے مثال میں غالب اور ذوق کا کلام پیش کیا ہے لیکن چونکہ وہ اس سے پہلے یہ لکھ چکے تھے

میرانیس کا خاندان دلّی کا خاندان تھا، اگرچہ اُن کے

پردادا میر ضاحک دہلی سے چلے آئے تھے اور فیض آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی تاہم دہلی کی جو جو خصوصیات تھیں وہ آخر تک اس خاندان میں قائم رہیں۔ میر انیس اکثر موقعوں پر ناز کے لہجے میں کہتے تھے "صاحبو ارباب لکھنؤ اس طرح نہیں بولتے یہ میرے گھر کی زبان ہے" اس بنا پر جابجا جگہ کو جاگہ لکھا ہے اور یہ صرف تحریری زبان نہیں وہ یوں ہی بولتے بھی تھے ۱؎

اس سے معترضین کو موقع ہاتھ آگیا اور انھوں نے دونوں عبارتوں کو یکجا کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ میرانیس لکھنؤ کی زبان سے دہلی کی زبان کو بہتر سمجھتے تھے اور وہاں کی لفظیں استعمال کر کے ناز کرتے تھے۔ حالانکہ خود مولانا شبلی نے آخر میں یہ لکھ دیا ہے :۔

میرانیس نے بہتر برس کی عمر پائی ان کی ابتدائی مشق میں قدیم محاورے اور غلط الفاظ نہایت کثرت سے متداول تھے اور شعراء ان کو بے تکلف استعمال کرتے تھے

اس قسم کے الفاظ میرانیس کے ہاں بھی ہیں اور کثرت سے ہیں لیکن وہ ابتدائے مشق کے ہیں ورنہ شیخ ناسخ کے اثر یا خود مذاق بدلنے سے جس قدر زمانہ گزرتا گیا میر صاحب قدیم مخصوص الفاظ اور تراکیب چھوڑتے گئے ۲؎

۱؎ موازنہ انیس و دبیر ص۲۳ ۲؎ موازنہ انیس و دبیر ص۲۶

مولانا شبلی کے علاوہ بھی جس جس نے انیسؔ و دبیرؔ کا مطالعہ کیا ہے یہی رائے دی ہے۔ سید نظیر الحسن صاحب فوق مصنف المیزان کی رائے یہ ہے :۔

میر صاحب اور مرزا صاحب دونوں کے کلام میں جس قدر ابتدائی زمانہ کا کلام ہے اسی قدر اوسط زمانے اور اسی قدر کہنہ مشقی کا ہے۔ دونوں صاحبوں نے اردو زبان کی پستی اور بلندی کے زمانے دیکھے ہیں پس ابتدائی کلام میں آج کل کے محاورے کے خلاف کوئی لفظ آگیا ہو تو ہرگز قابل اعتبار نہیں۔ خیال کرنا چاہیئے ۔ مرثیہ گوئی ابتدا میں کیا تھی اور انتہا میں کیا ہو گئی

دونوں صاحبوں کے آغاز شاعری کا زمانہ مصحفی انشاء جرأت وغیرہ سے ملا ہوا تھا اور چونکہ مرزا صاحب میر صاحب سے بہت پہلے کے شاعر ہیں اس لئے پرانے محاورات کا میر صاحب کے کلام سے زیادہ ان کے کلام میں پایا جانا قرین قیاس ہے۔ مرزا صاحب جس زمانہ سے مرثیہ کہتے تھے اس زمانہ میں اکثر الفاظ جو آج کل متروک ہیں مروج تھے۔ اور بہت سے ثقیل الفاظ جائز سمجھے جاتے تھے مثلاً اِدھر اُدھر کی جگہ ایدھر ودھر اونکو کے عوض انکوں سے کے بدلے ان سے ٹک اور زور کا لفظ بہت کے معنوں میں آئے ہے۔ جائے ہے۔ ٹک ۔ بلا ۔ یے موصوف جمع ہوا اور صفت لفظ ہندی تو موصوف کی مطابقت کے لئے صفت کو جمع لانا جیسے ع

بڑیاں محنت کی بھی پہنیں تو ہم نے بھاریاں

فارسی جمع کو بے اضافت یا صفت کے لانا جیسے ع

رفتگاں کا بھی خیال اے اہل عالم چاہیئے

چنانچہ مرزا صاحب کے ابتدائی کلام میں بھی اس قسم کے الفاظ موجود ہیں سلہ

مولانا اشہری کے الفاظ یہ ہیں :۔

میر صاحب آج کے شاعر نہیں۔ میر صاحب کی شاعری کا زمانہ ناسخ و آتش کے وقت سے شروع ہوتا ہے جبکہ کتنے الفاظ اور ترکیبیں زمانہ میرؔ و سوداؔ کی باقی تھیں اس لئے بعض الفاظ میر صاحب کے کلام میں بھی اس وقت کے نظر آتے ہیں جو قابل گرفت نہیں سلہ

میر افضل علی صاحب ضو رد م الموازنہ میں لکھتے ہیں :۔

مرزا صاحب مرحوم کے طولانی و مختصر مرثیے دو ہزار سے زیادہ ہوں گے ان میں اس زمانہ کا بھی کلام ہے جبکہ اودھر ایدھر کون اور سینتی بولتے تھے۔ ادھر اُدھر و اُن کو کا و ان سے کی جگہ پر چنانچہ قتل سودا مرحوم مرزا صاحب مرحوم کا ایک مرثیہ ہو مصرع ہے یعنی ہر بند کے چار مصرع کیونکہ مرزا صاحب مصحفی کے زمانہ سے مرثیہ کہتے تھے اور اس وقت جملا اغلاط بالتعمد جائز سمجھے جاتے تھے پس

سلہ المیزان صفحہ ۵۳۰ سلہ حیات انیس صفحہ ۲۶۲

مشق کے اوائل زمانہ کی تصنیفات کو اواسط اور اواخر مشق کے زمانہ سے ضرور فرق ہونا چاہیئے۔ سو ہے افسوس اہل مطابع نے اپنے فائدہ فروخت کی جہت سے وہ سب کلام خلط کر دیا [۱]

امیر احمد صاحب علوی بی اے کہتے ہیں :۔

انیس کا کلام تقریباً نصف صدی کی زبان کا مجموعہ ہے بعض الفاظ و محاورات جو انکی نوعمری میں مستعمل تھے۔ پختہ مشق کے دور تک باقی نہیں رہے تھے اور ان کی پیرانہ سالی میں زبان اردو بہت صاف اور شستہ ہو چکی تھی ابتدائی کلام میں بہت سے الفاظ پائے جاتے تھے جن کو آخر زمانہ میں انھوں نے ترک کر دیا تھا۔ علاوہ اُس کے اُن مجموعۂ کلیات میں اغلاط کتابت اور تحریفات کو بھی کافی دخل ہے اس لئے جب تک کوئی انوکھا محاورہ کلیات میں متعدد مقامات پر نہ دیکھا جائے اور آخر زمانہ کے کلام میں بھی نہ پایا جائے بطور سند کے نہیں پیش کیا جا سکتا [۲]

جب انیس و دبیر کے کلام کی یہ حالت ہے تو آتش (جو ان سے بھی مقدم تھے) اپنے کلام کو ایسی لفظوں اور ترکیبوں سے کب پاک رکھ سکتے تھے۔ مولوی عبدالحی مرحوم لکھتے ہیں :۔

آتش کے ہاں بعض موقعوں پر رقیباں، خوباں

[۱] روالموازنہ ص۳ [۲] یادگار انیس ص۲۴

انگھڑیاں، زور یل بے بن جائے بغیر میرے خامل بجائے میرے ساتھ پیسارے بجائے پھیلائے۔ شراکت بجائے شرکت فی الواقعی بجائے فی الواقع، ایک آدھ جگہ موصوف کی مناسبت سے صفت کو جمع بھی کر دیا ع

بڑیاں منت کی بھی پہنیں تو پینے بھاریاں

اسی قسم کے اور بھی الفاظ پائے جاتے ہیں جس میں نے بعض روزمرہ کے جرم میں نکالے جا چکے ہیں اور بعض غلط ہیں کچھ عجب نہیں کہ یہ ان کا ابتدائی کلام ہو [۱]

([۱] گل رعنا ص۶۳ تا ۶۴

یہی وہ مقام ہے جہاں ناسخ کا آفتاب کمال درخشاں نظر آتا ہے اور عقیدت کی جبینیں جھک جاتی ہیں کہ بقول مولانا شبلی ان کے مذاق صحیح نے بعد کی آنے والی حالت کا اندازہ کر لیا اور ایسی تمام لفظیں ترک کر دیں جو بعد کو ترک ہونے والی تھیں۔ جن لوگوں نے ان کی پیروی نہیں کی انھیں بھی کچھ دنوں کے بعد اپنی رائے کی غلطی ماننا پڑی۔ پھر بھی وہ اساتذہ جو ناسخ سے ہمسری کا دعویٰ رکھتے تھے اگر کچھ لفظوں میں اختلاف کر کے پرانی لفظیں استعمال کرتے ہوں تو ان سے ان کی زبان دہلوی نہیں کہی جا سکتی جبکہ وہ دہلی کی بہت سی لفظیں ترک کر کے لکھنؤ کی درست کی ہوئی لفظیں اور ترکیبیں بھی اختیار کر چکے ہوں

آتش کے کلام میں تو ایسے محاورے بھی مل جائیں گے جو مصحفی وانشا وغیرہ کے آخری زمانہ سے ترک ہو چکے تھے اور دہلی والے بھی نہیں بولتے تھے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ زبان کے معاملہ میں دہلی یا

ناسخ کے پیرو نہ تھے بلکہ خود صاحب رائے تھے۔ ہر لفظ کے ترک واختیار میں اپنی رائے سے کام لیتے تھے اور ہو سکتا ہے کہ وہ اس معاملہ میں کوئی رائے ہی نہ رکھتے ہوں ان کی وارفتہ مزاجی اور طبعی آزادی کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اسی سے اہل فن کے نزدیک ان کا کلام سند نہیں۔ لکھنؤ کے مشہور ادیب شیخ ممتاز حسین مرحوم لکھتے ہیں:-

"لکھنؤ کے تمام شعراء ناسخ کو مستند سمجھتے ہیں اور آتش کو مستند نہیں خیال کرتے۔ آتش کا طرز مرغوب ہے لیکن اسے محقق فن کا مرتبہ کبھی حاصل نہیں ہوا۔ جو شخص غلط العام سے زیادہ مستفید ہوتا ہے وہ وہ محقق و مستند شاعر نہیں ہو سکتا [1]

انیس کا قول
مشہور ہے کہ میر انیس بعض موقعوں پر کہہ دیا کرتے تھے کہ "حضرات لکھنؤ یوں نہیں بولتے۔ یہ میرے گھرانے کی زبان ہے" معترضین نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ ان کا گھرانا دہلوی تھا لہٰذا میر صاحب لکھنؤ کی زبان کے مقابلے میں دہلی کی زبان پر فخر کرتے تھے اس سے لکھنؤ کی زبان پست اور انیس کی زبان دہلی کی ثابت ہوتی ہے اور اپنے گھر کی خصوصیت پر زور دینے کی وجہ ان دونوں [illegible] سے ثابت کرتے ہیں۔

---

[1] اخبار اودھ پنچ۔ جمعہ ۱۵ اپریل ۱۹۲۶ء

(۱) عمدۃ الملکی انجمن
عمدۃ الملک نواب محمد امیر خاں انجام نے اپنی نگرانی میں ایک انجمن قائم کی تھی جس میں الفاظ و محاورات پر بحث ہوتی اور بڑے رگڑے جھگڑے اور چھان بین کے بعد تحقیق شدہ الفاظ و محاورات انجمن کے دفتر میں درج ہوتے پھر سارے ہندوستان میں اس کی نقل بھیجی جاتی اور دیگر امراء اسی کی تقلید کرتے اسی دفتر وانجمن میں ضاحک بھی تھے۔ دلی کے بعد فیض آباد میں

(۲) فیض آباد کا ادبی دفتر
سالار جنگیوں کے شوق نے پھر اسی دفتر کو قائم کیا تو ضاحک و میر حسن کو اس سے خاص تعلق رہا۔ اسی دفتر انجمن کو یاد کر کے میر انیس اپنی زبان پر ناز کیا کرتے تھے۔

ان دونوں واقعات کا مہدی حسن احسن نے کوئی ماخذ نہیں بتایا لیکن تمام مصنفین کا ماخذ یہی "واقعات انیس" ہے۔ درایت کے اصول سے تو یہ دونوں روایتیں غلط ہیں۔ درایت کے لحاظ سے بھی ناقابل قبول ہیں۔ کمیٹی کے ذریعہ اصلاح زبان کا واقعہ اتنا اہم ہے کہ اس کے تمام جزئیات و تفصیلات مستند راویوں کے ذریعہ ہم تک پہنچنا چاہیئے۔ جب شخصی اصلاحیں میرزا مظہر جانجاناں ایسے لوگوں کی برابر ذکر ہوتی چلی آئیں تو وہ اصلاحیں جو ایک با اثر نواب ذی اقتدار، حاکم، مستند افراد اور با قاعدہ ادارہ کی تھیں گمنامی کے پردہ میں پڑی رہیں۔

تمام مصنفین اور خاص طور سے دہلی کے قدیم باشندے وہاں کے رئیسوں شاعروں، انشا پردازوں اور مورخوں کے تربیت یافتہ اردو کے اصلی اور نسلی مالک خود اہل زبان اور تاریخ زبان کے مصنف شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد اس سے بے خبر ہیں اور ڈیڑھ سو برس کے بعد احسن صاحب کو اس راز سربستہ کا علم ہو تو ہم اُسے الہام سمجھیں گے۔ پھر یہ کہ محاورہ ایسی چیز نہیں جو رگڑوں جھگڑوں سے طے کیا جائے اور دفتر میں درج ہو کر ملک بھر میں مروج ہو جائے۔ اس لئے یہ روایتیں درایت[1] کے لحاظ سے بھی نا قابل قبول ہیں۔ محاورہ کیوں کر بنتا ہے احسن صاحب اس سے ناواقف ہیں۔

جہاں تک لکھنؤ اور دہلی کی زبان میں ترجیح کا تعلق ہے تو انیس لکھنؤ کی زبان کو دہلی کی زبان سے بہتر سمجھتے تھے۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں:۔

میر صاحب کے ایک دوست دہلی جانے لگے تو اُن سے فرمایا کہ تم دہلی جاتے تو ہو مگر تمہاری زبان بگڑ جائے گی پھر وہی ورے پرے بولنے لگو گے[2]

مولوی امیر احمد صاحب علوی بی، اے تحریر فرماتے ہیں:۔

میر صاحب کو اپنی زبان پر ناز تھا اور بعض محاورات میں اہل لکھنؤ کی تقلید نہیں کرتے تھے۔ تاہم یہاں کی مروجہ زبان[3]

---

[1] درایت یہ اس لحاظ سے غور کرنا کہ وہ انسانی طبیعتوں۔ زمانی خصوصیتوں اور عقلی قرینوں کے مطابق ہے یا نہیں درایت ہے۔

[2] حیات انیس [3] یادگار انیس ص

کو دہلی کی مروجہ اردو سے بہتر سمجھتے تھے۔

اب رہا انیس کا قول اس میں معذرت کی شان صاف نظر آتی ہے اور یہ اُن لفظوں اور محاوروں سے متعلق معلوم ہوتا ہے جو اہل لکھنؤ کے نزدیک غلط یا غیر فصیح تھے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس قول سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی زبان امتیازی شان رکھتی تھی اور ہو سکتا ہے کہ یہ میر انیس کے ابتدائی زمانہ کا قول ہو اور انہیں پرانی لفظوں اور محاوروں سے متعلق ہو جو ان کی زبان پر رہ گئے تھے اور اس وقت تک وہ ان کو ترک کے قابل نہ سمجھتے ہوں مگر بعد میں علامہ شبلی کے بقول جس قدر زمانہ گزرتا گیا ناسخ کے اثر اور مذاق کے بدلنے سے وہ ترک کرتے گئے ہوں اور اگر اسکے یہ معنی ہیں کہ کچھ لفظیں اور محاورے خاص ان کے گھر کے تھے تو وہ بھی لکھنؤ کی زبان کا جزو بن گئے ہوں گے کیونکہ یہ لوگ بھی تو لکھنؤ میں رہتے تھے۔ انیس کے خاندان کی زبان آج بھی لکھنؤ میں مستند مانی جاتی ہے۔

مولانا آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں:۔

ان کی بلکہ ان کے گھر کی زبان اردوئے معلی کے لحاظ سے تمام لکھنؤ میں مستند مانی جاتی ہے ص ۵۴۷

مولانا عبدالحئی تذکرہ گل رعنا میں تحریر فرماتے ہیں:۔

ان کی بلکہ ان کے گھرانے کی زبان اردوئے معلیٰ کے لحاظ سے تمام لکھنؤ میں سند تھی ص ۵۱۰

سید نظیر الحسن فوق المیزان میں تحریر کرتے ہیں:۔

ان کی بلکہ ان کے گھر کی زبان اردوئے معلیٰ کے لحاظ سے

تمام لکھنؤ میں مستند ہے

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ انیسؔ نے کچھ لفظیں اپنی زبان کی ترک کر کے لکھنؤ کی مخصوص لفظیں اختیار کیں اور کچھ محاورے اہل لکھنؤ نے انیسؔ سے لئے اس طرح دونوں کی زبان ایک ہو گئی اور انیسؔ نے زبان کی جو کچھ خدمت کی وہ لکھنؤ کی زبان کی خدمت تھی اسی بنا پر شمس العلماء مولوی امداد امام اثرؔ عظیم آبادی لکھتے ہیں:۔

رزمی شاعری میں میر انیسؔ - ہومر، ورجل، ملٹن، اور فردوسی پر غالب ہیں —— کوئی شک نہیں کہ اردو کی رزمی شاعری درجۂ کمال کو لکھنؤ میں پہنچی اور الحق یہ امر حضرات لکھنؤ کے لئے ایک بڑا سرمایۂ ناز ہے۔ اسی طرح مرزا دبیرؔ نے شاعری کا رتبہ ایسا بلند کر دیا کہ اور زبانوں کی شاعری اسے دیدۂ حیرت سے نگراں ہے۔ ارباب حقیقت سے پوشیدہ نہیں ہے کہ لکھنؤ میں مرثیہ نگاری اس درجہ کو پہنچ گئی کہ خود کمال شاعری ہو رہی ہے۔ (کاشف الحقائق ص ۹۳)

مولانا عبد الحلیم شررؔ لکھتے ہیں:۔

لکھنؤ کے کمال مرثیہ گوئی نے سارے ہندوستان سے منوا لیا کہ عالم شعر و سخن میں مرثیہ گوئی کا رتبہ دیگر اصناف سخن سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے۔ (گزشتہ لکھنؤ ص ۳۲)

انھیں تاریخی حقیقتوں کو پیش نظر رکھ کے مولانا حالی نے کہا ہے ؎

اردو کو راج چار سو تیرا ہے — شہروں میں راج کو بکو تیرا ہے
پر جب تک انیسؔ کا سخن باقی ہے — تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا ہے

والسلام

ذرہ ناچیز شمس ۱۲، دسمبر ۱۹۳۷ء

ضمیمہ

یہ ضمیمہ اسی مضمون کا ایک حصّہ ہے جس کا ذکر دیباچہ میں آ چکا ہے اس حصّہ میں کچھ ایسی دلچسپ باتیں ہیں جن کا ذکر کتاب میں لانا محل تھا اس وجہ سے ضمیمہ کے طور پر داخل کر دیا ہے فقط مصنف

حقیقت حال کا جائزہ

جناب سید علی ضامن صاحب ترمذی بی۔اے جونپوری کا ایک مضمون حقیقت حال کے عنوان سے اخبار سرفراز کی متعدد اشاعتوں میں ناظرین کی ضیافت طبع کرتا رہا۔ اب کئی مہینہ بعد اس کا سلسلہ ختم ہوا تو میری باری آئی۔

موصوف کی طولانی بحث کا حاصل یہ ہے:۔

ہندوستان میں غالبؔ - آتشؔ - انیسؔ اور دبیرؔ کے بعد شاد عظیم آبادی اور اکبر الہ آبادی کے سوا کوئی شاعر نہیں ہوا۔

[illegible] اور ہے اور داغ کی شاعرانہ ساخت اور

لکھنؤ میں شاعر تو بہت ہوئے مگر کسی کو شاعری سے اچھا سا بھی لگاؤ نہ تھا۔

۳ [illegible] - انیسؔ اور دبیرؔ دہلوی تھے۔ ان کے کلام میں دہلی کے قدیم محاورے اور تمدن کے اشارے دہلی پر ناز اور اسکی یاد [illegible] ان بزرگوں کے علاوہ لکھنؤ میں اور کیا تھا۔ صفر

ہے ہو کا عالم ہے۔ ہاں جاہلانہ غرور اور لاف زنی کی وبا ہمیشہ پھیلی رہی۔

جو کچھ علمی سواد ہے وہ بزرگان جونپور کا فیض و صدقہ ہے وہ فرنگی محل ہو یا خاندان اجتہاد

توضیح | بعد کے مضامین میں موصوف نے انھیں باتوں کی یہ توضیح کی ہے :-

مجمل عبارت سے کچھ اور وہم بھی پیدا ہو سکتا ہے جسے صاف کر دینا ضروری ہے۔

آتش - انیس اور دبیر صاحبِ کمال تھے آخر الذکر دونوں بزرگوں کے گھرانوں کے افراد اپنے بزرگ کے پورے پیرو اور ہم رنگ ہیں انھیں ان کے بزرگوں کی فہرست میں اور اس بحث سے مستثنیٰ سمجھنا چاہیے۔

انیس و دبیر نے جو زبان غزل اور قصیدے کے محدود مضامین میں گھری ہوئی تھی اسے رزم بزم اور فضائے عالم کے داخلی اور خارجی مضامین کے بیان سے وسعت دی۔

لکھنؤ کی شاعری سے مراد ناسخ کا رنگ ہے ان کے ایک شاگرد منیر کا شعر ہے ؎

چھڑا اچلا فلک پہ بہت خانہ جنگ کا
چھوٹا ہے نیل گاؤ پہ کُتا تفنگ کا

جب یہ شعر انھوں نے مرزا دبیر کے سامنے پڑھا تو کچھ لڑکے

وہاں کھڑے تھے وہ ہنستے ہوئے بھاگے اس سے لکھنؤ کی شاعری کی مقبولیت ظاہر ہو جاتی ہے۔

یہ ہیں فاضل مقالہ نگار کی وہ نکتہ آفرینیاں جن پر انھیں اور ان کے ہوا خواہوں کو بڑا ناز ہے۔ اس میں نقطہ بحث یہ ہیں :-

(۱) کیا غالب، آتش- انیس اور دبیر کے بعد شاد و اکبر کے سوا کوئی شاعر نہیں ہوا؟

(۲) کیا آتش اور انیس و دبیر کی شاعری دہلوی ہے؟

(۳) کیا آتش اور انیس و دبیر دہلوی تھے؟

(۴) کیا انیس اور دبیر نے مرثیہ کو وسعت دی؟

(۵) کیا انیس اور دبیر کے خلاف اپنے اسلاف کے ہم رنگ ہیں؟

(۶) کیا منیر کا شعر لکھنؤ کی شاعری کا آئینہ ہے؟

(۷) کیا لکھنؤ کا علمی سواد بزرگان جونپور کا فیض و صدقہ ہے؟

ان باتوں پر ہم اسی ترتیب سے بحث کریں گے۔

۱- کیا غالب آتش انیس اور دبیر کے بعد شاد و اکبر کے سوا کوئی شاعر نہیں ہوا | بظاہر تو یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر محاذ اختلاف قائم کیا جائے لیکن ذوق سخن فہمی کے لئے تنگ [illegible] پھر اگر کسی غلطی کی اصلاح ہو جائے تو کیا برا ہے اس لئے اس پر گفتگو بیجا نہیں۔

فاضل مقالہ نگار نے اس دعوے کو مختلف جگہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر تمام پھیلی ہوئی عبارتیں یکجا کر دی جائیں تو کچھ

صفحے سیاہ ہو جائیں۔ مگر افسوس عبارت اول سے آخر تک اپنا
مطلب سمجھانے میں سراسیمہ ہے۔ دلیل دعوے سے اور دعویٰ حقیقت
حال سے بیزار۔ لیکن عبارت کو تنقید کی کسوٹی پر کسنا اور اس کی منطقی
کمزوریاں دکھانا انصاف نہیں کیونکہ خود انھوں نے اداءِ مطلب میں
اپنی بے بسی کا اقرار کر کے صاف کہدیا کہ لفظوں پر نہ جائیے مقصد
اور مقصد اور مفہوم کو سمجھئے۔ آئیے ہم بھی یہی کوشش کریں۔

پہلی فکر میں اس دعوے کا یہ مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ آتش
غالب انیس اور دبیر نے شاعری کو بلندی کے اُس آخری نقطہ پر
پہنچا دیا جس کے بعد زوال شروع ہوتا ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے
ہیں کہ ان کے بعد کوئی شاعر نہیں ہوا تو اس آندھی میں متقدمین بھی
اُڑ جاتے ہیں۔ اور بعد کی لفظ ان کو نہیں بچا سکتی۔ کیونکہ جب
کمال کے آخری نقطہ پر انہیں کو سمجھا جائے تو اگلے پچھلے سب پست
منزل میں آجاتے ہیں لیکن موصوف نے اپنے جواب میں اس مفہوم سے
انکار کیا ہے۔ تو دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ان کے بعد کوئی
ان کا ایسا شاعر نہیں ہوا۔ اس طرح خود ان لوگوں کا آسمان کمال
زمینِ بے کمالی بن جاتا ہے کیونکہ اس کے یہ معنی ہوں گے کہ یہ لوگ
شاعری کی اس آخری پست منزل میں تھے جس کے بعد شاعری پر شاعری
کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا انہیں دونوں صورتوں میں انحصار
ہے۔ دوسرے مفہوم کی تائید بھی ان کی اس عبارت سے ہوتی ہے:-

آتش۔ انیس۔ دبیر علیہ الرحمۃ کے درجہ کی کوئی مثال

لکھنؤ میں ان کے بعد بتائے تو اسے حقیقی شاعر سمجھا جائے
ورنہ زیادہ سے زیادہ کامیاب موزوں طبعوں اور مشاق
سخنوروں میں شمار ہوگا۔ شاعری کسب و کوشش سے نہیں
آتی یہ خدا کی دین ہوتی ہے ع

"شاعری جزویست از پیغمبری"

اس کے معنی یہ ہیں کہ "فطری" شاعری کا کم سے کم درجہ ان لوگوں
کو حاصل تھا جو اس حد پر بھی نہیں وہ شاعر ہی نہیں مگر مضمون کے تیور
بتاتے ہیں کہ فاضل مقالہ نگار ان کی عظمت کے پوری طرح قائل ہیں۔
اب مطلب کیا ہے؟ یہ ایک معمہ ہے جو الفاظ سے حل نہیں
ہو سکتا اور موصوف کی فرمائش بھی یہی ہے کہ لفظوں پر نہ جائے
اور مطلب سمجھے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ مطلب لفظوں ہی سے سمجھا
جاتا ہے۔

آئیے اٹکل سے کام لیں اور نیک نیتی کو راہ دیں تو جی یہی
چاہتا ہے کہ اس کا مطلب یہ سمجھیں کہ اگلوں کے کمال سے انکار
بھی نہیں اور یہ لوگ شاعری کو پست منزل میں بھی نہیں۔ لیکن "ان
کے بعد کوئی شاعر نہیں ہوا" ایسا ٹکڑا ہے جس میں نیک نیتی اور
حسن ظن بھی کوئی خوبصورت معنی پیدا کرنے سے عاجز ہے۔ یقیناً
اس میں احتیاط سے کام نہیں لیا۔

جوش طبعیت میں یہ فقرہ قلم سے نکل گیا اور اگر واقعی ان کا یہی خیال ہے تو بڑی بدذوقی اور بے علمی کی بات ہے۔ ہم اسی ترتیب سے فاضل مقالہ نگار کے ارشادات کا جائزہ لیں گے۔ فرماتے ہیں۔

۱۔ ہندوستان میں "غالب کے بعد اکبر الہ آبادی اور شاد عظیم آبادی کے سوا کوئی کوئی شاعر نہیں ہوا"

اس میں شک نہیں کہ بعض لوگوں کے کچھ پسندیدہ شاعر ہوتے ہیں جیسے کچھ لوگ ناسخ کے دلدادہ تھے۔ کچھ آتش کے کچھ انیس کے اور کچھ دبیر کے مگر اپنے پسندیدہ شاعر کے مد مقابل کے کمال سے کسی کو انکار نہ تھا اگر مقالہ نگار غالب و آتش دبیر و انیس، اکبر الہ آبادی اور شاد عظیم آبادی کو پسند کرتے ہیں تو کوئی اعتراض کی بات نہیں مگر ان کے بعد کوئی شاعر نہیں ہوا۔ انتہائی غلط ہے۔

ناسخ کے شاعرانہ کمال کا اعتراف خود غالب نے کیا ہے اور تمام شعرائے دہلی بلکہ تمام ہندوستان و نقادِ فن ناسخ کو موجدِ طرزِ جدید اور ناسخ طرزِ قدیم مانتے ہیں۔ اہلِ دہلی ان کی تقلید کا اعتراف کرتے ہیں جیسا کہ آپ گذشتہ اوراق میں پڑھ چکے ہیں۔

۲۔ "آتش اور انیس دبیر دہلوی تھے۔ ان کے کلام میں دہلی کے محاورے اور تمدن کے اشارے پائے جاتے ہیں"

لکھنؤ کی زبان اور تمدن دہلی کی زبان اور تمدن ہے جو دہلی والے اپنے ساتھ لائے۔ یہاں اُس کو ترقی ہوئی اور اس میں نکھار پیدا ہوا۔ یہی نکھار لکھنؤ کی زبان کا امتیاز اور دہلی کی زبان پر برتری کی علامت ہے۔ جسے تمام اُدبا نے تسلیم کیا ہے اشارے کیا سب کچھ وہی ہے اس سے آتش اور انیس و دبیر

کا دہلوی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

آتش خود اپنے کو لکھنوی سمجھتے تھے ان کا شعر ہے :۔

سنسان مثلِ وادیٔ غربت ہے لکھنؤ شاید کہ آتش آج وطن سے نکل گیا

(۳) "انیس و دبیر باکمال تھے ان کے گھرانے والے ان کے پیرو اور ہم رنگ ہیں اسی وجہ سے وہ اس بحث سے مستثنیٰ ہیں"

یہ بات بھی غلط ہے دبیر کے صاحبزادے آوج صاحب فرماتے ہیں :

وہ جھانکنا پس دیوار بیلوں کا چڑھ کر وہ روکنا اُنہیں ہر شاخ گل کا بڑھ بڑھ کر

ہر سے ہرے تھے چمن کھیتیاں لہکتی تھیں بغل میں گل کو لئے بلبلیں چہکتی تھیں

یہ مرزا دبیر کا رنگ کہاں ہے۔

میر نفیس فرماتے ہیں :۔

ثنائے یوسف شبیر سے جمالِ سخن

مری زبان کو شرف مدحِ پنجتن سے ملا

یہ میر صاحب کی زبان ہے نہ رنگ اسی طرح کے اُن کے گھرانے کے تمام شعرا کا مخصوص انداز ہے جو ان کے بزرگوں سے نہیں ملتا نہ وہ لوگ انیس و دبیر کے ایسے باکمال تھے ان کو بھی موزوں طبعوں کی فہرست میں لکھنا چاہیئے جو فاضل مقالہ نگار نے مرتب کی ہے۔

(۴) انیس و دبیر نے جو زبان غزل اور قصیدے کے مضامین میں محدود تھی۔ اسے فضائے عالم کے داخلی اور خارجی مضامین سے وسعت دی۔

یہ بات بھی تاریخ مرثیہ گوئی سے بے خبری کی دلیل ہے۔

مرثیہ کی اجمالی تاریخ

تمام اصنافِ سخن کی طرح مرثیہ کی ابتدا بھی دکن سے ہوئی جس کی صورت مسلسل مثنوی کی طرح تھی کچھ دنوں کے بعد چو مصرع بند مقرر ہوئے جس کا چوتھا مصرع پہلے بند کا ہم قافیہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد دہلی میں حیدر شاہ حیدری نے مسدس میں مرثیہ کہنا شروع کیا۔ ۱۱۳۵ھ کے بعد برہان الملک کے زمانہ میں لکھنؤ چلے آئے تھے۔ یہاں ان کی مرثیہ خوانی خوب چمکی اور یہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے بعد پنجاب کے رہنے والے میاں سکندر سودا کے ہمعصر تلاشِ معاش میں لکھنؤ آئے اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔ انہوں نے لکھنؤ میں پہلے پہل مسدس میں مرثیہ کہا جس کا مطلع ہے:

بے روایت شتر اسوار کسی کا تھا رسول

اس وقت مرثیہ تیس چالیس بندوں میں محدود تھا سب سے پہلے میر مظفر حسین ضمیر نے طولانی روایتیں نظم کرکے سو سوا سو بند تک مرثیہ پہنچایا، ایک عرصہ تک یہی طریقہ رہا، پھر ضمیر ہی نے رزم اور سراپا کہا جو اتنا مقبول ہوا کہ پہلے امانت نے ان کے بعد دوسرے شعراء نے واسوخت تک میں سراپا داخل کرلیا۔ لیکن میر انیس کے باپ میر خلیق نے اس ایجاد کو ناپسند کیا اور پُرانی روش پر قائم رہے حضرت آزاد لکھتے ہیں :۔

میر خلیق مرثیت کے کوچہ سے اتفاقاً ہی قدم بڑھاتے تھے وہ مضمون آفرینی کی ہوس کم کرتے تھے، اور ہمیشہ لطفِ زبان کو خیالات درد انگیز کے ساتھ ترکیب دے کر مطلب حاصل کرتے تھے ؎۱

۱؎ آبِ حیات

یادگار انیس میں اور صاف لفظوں میں لکھا ہے :۔

میر خلیق کا جوہر کمال لطفِ زبان کو خیالات درد انگیز کے ساتھ ترکیب دے کر اہلِ مجلس کو رُلانا تھا۔ وہ مرثیت کے کوچہ سے قدم آگے بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ اُنہوں نے ضمیر کی تقلید اپنے کمالات میں موجب افزائش نہ سمجھ کر رزمیہ مضامین سے احتراز کیا ؎۱

اس پر سب کو اتفاق ہے کہ پہلے میر ضمیر نے مرثیہ میں جدتیں کیں اور اس نئے طرز کا پہلا مرثیہ ۱۲۴۹ھ میں حضرت علی اکبر کے حال میں کہا جس کا مطلع یہ ہے:

کس نور کی مجلس میں مری جلوہ گری ہے ۔۔۔ کس نور سے پُر نور یہ نورِ نظری ہے
آمد ہی میں حیران قیاسِ بشری ہے ۔۔۔ یہ کون سی تصویر تجلی سے بھری ہے

گو حُسن کا رُتبہ نہیں مذکور ہوا ہے

منبر مرا ہم رتبۂ طور ہوا ہے

اس میں چہرہ۔ سراپا، جنگ اور شہادت ہے اسی مرثیہ کے مقطع میں وہ کہتے ہیں اور بجا کہتے ہیں ؎

دس میں کہوں سَو میں کہوں یہ درد ہے میرا

اس طرز میں، جو جو کہے شاگرد ہے میرا

اس کے بعد اُنہوں نے اس کو اور پھیلایا، چہرہ، رخصت سراپا، آمد۔ رجز گھوڑے کی تعریف، اسلحہ جنگ کے اوصاف، بھی لکھے ان کے بعد ان کے شاگرد مرزا دبیر نے اس طرز کو معراج کمال تک پہنچایا، خود انیس نے مرثیہ میں کوئی جدت نہیں کی بلکہ اپنی خاندانی روش اور باپ کے اصول کے خلاف میر ضمیر لکھنوی کی تقلید کی۔ مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں :۔

مولانا کے اس بیان سے ثابت ہوگیا کہ لکھنؤ کے تمدن میں دہلی کے تمدن کے اشارے سمو لازمی اور بے جا تعجب ہے۔

(۶) کیا آتش، انیس اور دبیر دہلوی تھے

یہ ایک بے مغز بات ہے جس پر گفتگو کر کے ہم وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے اگر میر و غالب دہلوی اور ناسخ لکھنوی تھے تو آتش اور انیس و دبیر بھی لکھنوی تھے۔ خود آتش اپنے کو لکھنوی سمجھتے تھے اُن کا شعر ہے:-

شاید کہ آتش آج وطن سے نکل گیا
برباد مثلِ وادیٔ غربت ہے لکھنؤ

(۷) کیا منیر کا شعر لکھنؤ کی شاعری کا آئینہ ہے؟

فاضل مقالہ نگار نے منیر کا شعر پیش کر کے ان تمام اعتراضوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو لطف جذبات تنقید حیات اور خیال کی گہرائی سے خالی ہے۔ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ تمام اصناف سخن کو لکھنؤ نے ترقی دی۔ اس سلسلہ میں ذیل کی صنفیں پیش کی جاسکتی ہیں:-

(۱) غزل (۲) قصیدہ (۳) رباعی (۴) مثنوی (۵) قطعہ۔ (۶) نظم (۷) سلام (۸) مرثیہ (۹) نوحہ (۱۰) واسوخت (۱۱) ریختی۔

غزل

غزل کے سلسلہ میں جب ہم غور کرتے ہیں تو لکھنؤ اور دہلی دونوں میں توازن پایا جاتا ہے۔ اگر درد۔ میر۔ سودا۔ مصحفی۔ انشا۔ نصیر۔ ذوق۔ غالب۔ مومن۔ شیفتہ اور داغ نے دہلی میں غزل کی زمین کو آسمان بنایا تو ناسخ، آتش، رند، اسیر، قلق، وزیر، صبا، تعشق، رشک، برق، میر، جلال، شرف، ماہر، جاوید، نظم، رسوا، صفی، آرزو، عزیز، اثر، ثاقب اور محشر نے لکھنؤ میں غزل کو معراج تک پہنچایا۔

قصیدہ

قصیدہ میں اگر سودا، ذوق، غالب اور مومن دہلی کے انوری و خاقانی ہیں تو منیر، صفی، عزیز، محشر لکھنؤ کے عرفی و قاآنی ہیں۔

ان صنفوں میں لکھنؤ کے شاعروں کا منتخب کلام دہلی کے شاعروں کے منتخب کلام سے کسی طرح کم رتبہ نہیں۔ اور شاعری کی بعض قسمیں ایسی ہیں جن میں لکھنؤ والے منفرد نظر آتے ہیں ان میں مرثیہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے جو وسعت کے لحاظ سے تمام اصنافِ سخن کو اپنے اندر جذب کئے ہوئے ہے۔

دنیا کی اور زبانوں میں عظیم الشان نظمیں جن کی زبان اور خیالات نے ملک کی ذہنیت اور اخلاق کو متاثر کیا یہ ہیں:-

(۱) ایلیڈ (۲) اینیڈ (۳) پیراڈائز لاسٹ (۴) مہابھارت (۵) رامائن (۶) شکسپیر کے بعض ڈرامے (۷) شاہنامہ۔

ان سب پر لفظی و معنوی حیثیتوں سے انیس کے مرثیہ کو فوقیت ہے۔ ہومر کی ایلیڈ میں سولہ ہزار ورجل کی اینیڈ میں دس ہزار والمیک کی رامائن میں اڑتالیس ہزار فردوسی کے شاہنامہ میں ساٹھ ہزار سے زیادہ شعر نہیں۔

ایلیڈ کے افراد باعظمت نہیں ان کی ذاتی خوبیاں دلوں کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتیں مہابھارت کسی خاص فکر کا نتیجہ نہیں۔ اس کی ترتیب و تہذیب متعدد دماغوں کی کاوشوں سے صدیوں کی کوششوں میں ہوئی۔ پیراڈائز لاسٹ کا موضوع عظیم الشان نہیں۔ شکسپیر کے ڈرامے اور شاہنامہ کا موضوع اتنا وسیع ہے اور ان میں اتنی متفرق ہستیاں کام کرتی نظر آتی ہیں کہ پڑھنے والا کسی ایک کے ساتھ کامل ہمدردی نہیں پیدا کرسکتا۔ ہاں رامائن کا موضوع بے شک اعلیٰ ہے۔ ہندوستان کے ادب و اخلاق کی درستی میں اس کا زبردست حصہ ہے۔ اس کے رجال داستان بھی باعظمت ہیں لیکن وہ ایک طربیہ نظم ہے جو حزنیہ کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتی۔ اس کے علاوہ مرثیہ کی سی وسعت اور تنوع اس میں نہیں۔

فنی حیثیت سے مرثیہ ایک مکمل نظم ہے جس میں ابتدا، وسط اور انتہا ہے عظمت اور وحدت عمل ہے۔

مقصد کے لحاظ سے بلند اخلاق کا اعلیٰ معیار پیش کرتا ہے۔ جرأت، شجاعت، حمیت، ایثار، قربانی۔ سچائی۔ اخوت۔ مساوات۔ وفاداری۔ عزت نفس۔ ہمدردی، صبر، شکر، تحمل، ظالم سے نفرت، مظلوم سے ہمدردی، حق کی حمایت، باطل سے بیزاری۔

شاعرانہ حیثیت سے وہ تنقید حیات بھی ہے۔ تخیل بھی اور محاکات بھی، مرقع جذبات بھی ہے اور آئینہ احساسات بھی۔

ظاہری حیثیت سے اس میں سادگی۔ اصلیت۔ جوش، سنجیدگی۔ عظمت اور جزالت ہے۔ تنوع کے لحاظ سے بلند مرتبہ افراد کی مدح۔ پست فطرت اشخاص کی قدح۔ اعلیٰ اوصاف پر فخر۔ پند و موعظت۔ محبت و عداوت، استعجاب و حیرت، غیظ و غضب۔ مناظر فطرت کی عکاسی اور جذبات فطرت کی مصوری، میدان جنگ کا نقشہ، محفل عیش کا ہنگامہ۔ وصل کی حالت، جدائی کا صدمہ۔ مختصر یہ کہ دنیائے آب و گل کی ہر کیفیت۔ کائنات کا ہر ذرّہ اور انسانی زندگی کا ہر پہلو اس کا موضوع ہے۔ اس لئے جو کچھ تمام اصناف سخن میں ہے وہ سب مرثیہ میں موجود ہے۔ اور یہی وہ صنف ہے جو اردو کے لئے مخصوص ہے اسکی بدولت وہ تمام دنیا کے مقابلہ میں خم ٹھونک کے کھڑی ہو سکتی ہے اور اُس کے موجد تنہا اہل لکھنؤ ہیں۔ مقدار کے لحاظ سے بھی اس کا سرمایہ اتنا ہے جو کسی اور صنف کا نہیں۔ مرثیہ انیس ہی تک محدود نہیں بلکہ ان کے خاندان میں مونس، اُنس، نفیس، وحید، رشید، عارف، عروج، فائق اور فائز کے مراثی کسی طرح نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔

دبیر کے خاندان میں اوج اور رفیع۔

[illegible] میں امید، خورشید، ماہر، جاوید، فاخر، ذاخر، حسین، آشفتہ۔ [illegible] میں ضمیر، عشق، تعشق، فصیح، کامل، مودب، خبیر، تمر وغیرہ کے [illegible] ہیں۔ دنیا کی کوئی زبان رزمیہ کا اتنا عظیم الشان ذخیرہ نہیں رکھتی۔

[illegible] سکندر شاہ نامہ۔ سام نامہ۔ برزو نامہ۔ فرامرز نامہ۔ برو نامہ، شہریار [illegible] نامہ۔ خاور نامہ۔ تغلق نامہ۔ تیمور نامہ۔ ہمائے ہمایوں۔ اکبر نامہ۔ [illegible] جہاں نامہ۔ شاہنامہ نادری۔ شاہنشاہ نامہ۔ ظفر نامہ۔ عادل نامہ۔ [illegible] ٹیپو سلطان۔ تاج الفتوح۔ بہمن نامہ۔ آئینہ سکندری۔ حملۂ حیدری وغیرہ۔

[illegible] اس نام کی مثنویاں ہیں۔ ایک تو وہی جس کا نامور مصنف فردوسی ہے۔ دوسری [illegible] کی تصنیف ہے جس نے شاہ عباس اعظم کا شاہنامہ لکھا ہے۔ تیسری [illegible] بیگ وکی نے شاہ عباس کے محاربات میں چالیس ہزار بیت کی لکھی ہے [illegible] ہندوستان بھی آیا تھا یہاں اس نے عالیجاہ اور ذوالفقار خاں کی جنگ [illegible] وہی ذوالفقار خاں سے

[illegible] حیدری ز تو آشکا نام تو در نبرد کند کار ذوالفقار (بیدل)

[illegible] اس نام سے بھی کئی رزمیہ داستانیں لکھی گئیں جن میں نظامی کی مثنوی سب سے زیادہ مشہور ہے۔

[illegible] اس نام کی بھی دو مثنویاں ہیں ایک ایران میں فتح علی شاہ قاچار کے زمانہ کی [illegible] ہے، دوسری ہندوستان میں عہد شاہجہانی کی۔

بے خبر نہیں۔ یہ سب کتابیں اپنے موضوع کے اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں جملہ حیدری کے سوا اور کتابوں کے افراد ایسی شخصیتیں نہیں رکھتے۔ جن کا تعلق نفس انسانیت سے ہو زبان و بیان کے لحاظ سے بھی شاہنامہ فردوسی اور سکندرنامہ نظامی کے علاوہ کسی کو کوئی درجہ حاصل نہیں۔

مثنوی مثنوی کی ابتدا عرب سے ہوئی جسے اس زبان میں مزدوجہ کہتے ہیں۔ سب سے پہلی مثنوی شیخ ابوالعلی محمد بن العتاہیہ عباسی نے بحر رجز میں الصادح والباغم کہی۔ اس کے بعد شیخ بہاالدین عاملی نے بحر وافر میں ریاض الارواح اور بحر رمل میں سوانح سفر الحجاز کہی۔ بحر خفیف میں کسی عربی شاعری کی مثنوی موجود نہیں۔ ہندوستان میں البتہ غلام علی آزاد نے ایک مبسوط مثنوی مظہر البرکات مثنوی کے مخصوص اوزان خفیف میں کہی ہے۔ مگر یہ سب نہایت کم رتبہ چیزیں ہیں جن کا وجود عدم کے برابر ہے۔ بے شک شعرائے ایران نے اس صنف کو معراج کمال تک پہنچایا۔ ہندوستان میں اس کی ابتدا بھی دکن سے ہوئی اور سب سے پہلی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ ہے اس کا مصنف نظامی ہے جو علاء الدین بہمنی کے زمانہ کا شاعر ہے۔ یہ ۸۱۷ھ ۱۴۲۱ء کی تصنیف ہے۔

۱۰۱۸ھ میں ملا وجہی نے قطب و مشتری تصنیف کی۔

نصرتی کی مثنوی علی نامہ جس کا سن تصنیف دس سو اڑسٹھ ۱۰۶۸ ہوئی ہے۔ بہت بلند پایہ ہے۔ اب تک ایسی رزمیہ مثنوی اردو میں نہیں کہی گئی۔ اس کے بعد دکن میں کثرت سے عشقیہ مثنویاں تصنیف و ترجمہ ہوئیں۔

شمالی ہند میں میر و سودا ایسے کامل استادوں نے مثنویاں کہیں۔ مگر مقبول یہاں تک کہ لکھنؤ شاعری مرکز ہوا۔ اور میر حسن کی بے نظیر مثنوی وجود میں آئی۔

اس کے بعد پنڈت دیا شنکر نسیم نے گلزار نسیم کہی جو لفظوں کے انتخاب تشبیہوں اور استعاروں کی ندرت لفظی و معنوی صنعتوں کے باوجود مصرعوں کی برجستگی اور بندش کی چستی کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہے۔

نواب مرزا شوق نے زہر عشق کی داستان فطری لب و لہجہ میں اس خوبی و اختصار سے بیان کی ہے کہ اردو کی کوئی مثنوی ان خوبیوں میں اس سے ٹکر نہیں کھاتی۔

آفتاب الدولہ قلق نے طلسم الفت ایسی مؤثر زبان میں کہی ہے کہ اردو کی کسی مثنوی کو ایسی زبان نہیں ملی۔

احمد علی شوق نے سب سے آخر میں عالم خیال تصنیف کی۔ جس میں نادر تشبیہیں۔ نازک استعارے۔ بلیغ کنائے۔ لطیف اشارے۔ زبان و بیان کی نزاکت۔ قدرت کے مناظر، فطری جذبات۔ اصلیت، متانت۔ توازن، کامیاب مصوری۔ اختصار، ایسے اوصاف ہیں جو مجموعی حیثیت سے اردو کی کسی مثنوی کو نصیب نہیں۔

اگر مذہبی اور اخلاقی مثنویوں کو بھی شریک کر لیا جائے تو اسیر کی مظہر العجائب، بسمل کی معراج المضامین اور صفی کی تنظیم الحیات کا جواب اردو میں نہیں۔ اور کثرت کو دیکھا جائے تو شمار ممکن نہیں۔

سب کو تسلیم ہے کہ اردو کی بہترین مثنویاں لکھنؤ میں تصنیف ہوئیں اور اس صنف کو ترقی دینے والے صرف اہل لکھنؤ ہیں۔

نظم قومی۔ اخلاقی۔ سیاسی اور منظریہ نظموں سے دہلی والے آشنا نہیں۔ ایسی نظموں کا جو کچھ سرمایہ اردو میں ہے۔ وہ صفی، عزیز۔ چکبست، شوق، جوش اور اثر کے قلم کی تراوش ہے۔ دہلی میں غالب کی صرف ایک نظم ہے۔

رباعی یہ مسلم ہے کہ رباعی فلسفیوں کی گود میں پلی اس وجہ سے اس میں لفظی حیثیت سے

متانت۔ جزالت اور سنجیدگی ہے تو معنوی اعتبار سے بے ثباتی دنیا۔ فقر و استغنا۔ حقیقت و معرفت۔ پند و موعظت۔ تصوف و حکمت اس کا موضوع ہے۔ ایسی خشک باتیں شاعرانہ انداز میں لطف زبان اور زور بیان کے ساتھ دو شعروں اور خاص بحروں میں کہہ دینا آسان نہیں۔ اس صنف کو لکھنؤ میں مرثیہ گویوں نے اتنا عروج دیا کہ اس کا سرمایہ مقدار و خوبی میں اتنا اور ایسا ہے کہ کسی صنف سے کم یا پست نہیں کہا جا سکتا۔

سلام سلام کے متعلق یہ دعویٰ کرنا تو مشکل ہے کہ اردو کی ایجاد ہے کیونکہ اس طرح کی نظمیں فارسی میں بھی ملتی ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اردو میں اس کو فارسی سے زیادہ ترقی ہوئی اور صرف اہل لکھنؤ کی کوشش سے۔

نوحہ جہاں تک معلوم ہے دوسرے اصناف سخن کی طرح نوحہ کی ابتدا بھی دکن سے ہوئی۔ دہلی میں اس کا وجود کم ہے۔ لکھنؤ میں بہت ترقی ہوئی۔

ریختی ریختی دہلی کے ایجاد ہے لیکن ترقی اس کو لکھنؤ میں ہوئی میر یار علی جان اس میدان کے مشہور شہسوار ہیں۔ آج کا ذوق سلیم اس کو گوارا نہیں کرتا۔ اس لئے متروک ہے۔

واسوخت واسوخت بھی لکھنؤ میں دہلی سے آئی مگر نوزائیدہ حالت میں امانت کی تربیت میں یہاں پل کر جوان ہوئی۔ آج یہ بھی ریختی کی طرح متروک ہے۔

ڈرامائی نظم ڈرامائی نظم کی ایجاد خاص لکھنؤ میں ہوئی۔ دہلی والے اس سے واقف نہیں امانت کو اس کی ایجاد کا فخر حاصل ہے۔ اس تفصیلی تبصرے سے یہ ظاہر ہو گیا کہ شاعری کی کچھ صنفوں میں لکھنؤ اور دہلی شریک مساوی اور کچھ میں لکھنؤ شریک غالب اور کچھ کا لکھنؤ تنہا مالک ہے۔ ان میں مرثیہ کو سب زیادہ اہمیت ہے۔ لفظی اور معنوی خوبیوں کے لحاظ سے بھی اور زیادتی کے

اعتبار سے بھی۔ لیکن تمام اصناف سخن کو چھوڑ کے صرف غزل اور اسکے بھی تمام اچھے شعر چھوڑ کے بُرے سے بُرا شعر ڈھونڈھ کے لکھنؤ کی شاعری کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے جو ایک جھوٹے الزام کی حیثیت رکھتا ہے۔ کمال کی سند بہترین اشعار ہوتے ہیں۔ دہلی کی شاعری کا جو مخصوص رنگ کہا جاتا ہے اس کے بدترین نمونے خود دہلی والوں کے یہاں موجود ہیں۔ میرؔ ایسے خدائے سخن کے متعلق "بلندش بغایت بلند و پستش بغایت پست"۔ مشہور ہے۔ کیا وہی بغایت پست کلام سامنے رکھ کر ان کی شاعری پر حکم لگایا جاتا ہے؟

فاضل مقالہ نگار فرماتے ہیں:۔

"لکھنؤ کی شاعری سے مراد ناسخ کا رنگ ہے۔ ان کے ایک شاگرد منیر کا شعر ہے

چھرا چلا فلک پہ نہیب خانہ جنگ کا
چھوٹا ہے نیل گاؤ پہ کتا تفنگ کا

یہ شعر جب انہوں نے مرزا دبیر کو سنایا تو وہاں کچھ لڑکے کھڑے تھے جو ہنستے ہوئے بھاگے"۔

فاضل مقالہ نگار کو یہ نہیں معلوم کہ منیرؔ ناسخؔ کے نہیں میر علی اوسط رشک کے شاگرد تھے۔ اگر یہ شعر لکھنؤ کی شاعری کا نمونہ ہے تو دہلی کی شاعری کا نمونہ اُن کے پسندیدہ شاعر غالبؔ کے کلام سے سنیئے۔

تماشا کر اے محو آئینہ داری

معلوم ہوتا ہے کہ معشوق کوئی مداری۔ نٹ یا بھانڈ ہے جس سے کہا جا رہا ہے کہ آئینہ داری چھوڑ تماشا دکھا جو تیرا فن ہے۔ اور سنیئے

بروئے شفرہ کباب دل سمندر کھینچ

یہ کون سا مضمون ہے اور کہاں کی زبان ہے؟

بھون پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

جہاں تک میری نظر ہے شعرائے لکھنؤ نے بھووں اور بھویں نظم کیا ہے بھون کسی نے نہیں نظم کی۔ اگر لکھنؤ کے لڑکے غالبؔ سے بھون سنتے تو ہنستے ہنستے ان کے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔

موسیٰ اور عیسیٰ حالتِ اضافت میں طوسی کے وزن پر بولا جاتا ہے جیسے موسیٰ عمران عیسیٰ دوراں لیکن بغیر اضافت کے موسیٰ اور عیسیٰ بروزن بھوسا بولتے ہیں غالبؔ کی مشہور غزل جس کا معرکہ آرا شعر یہ ہے۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں　　　وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

اسی میں یہ شعر بھی ہے ؎

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ　　　ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

یہاں عیسیٰ بروزن طوسی کتنا سامعہ خراش ہے جس کا احساس غالبؔ کو نہیں ہوا۔

اور سنیئے :۔

یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

فردوس کسی نغمہ کا نام نہیں جس کا تعلق سماعت سے ہو یہ مصرع یوں ہونا چاہیئے تھا۔

یہ جنتِ نگاہ وہ لحنِ سروش ہے

یہ سب مقالہ نگار کے پسندیدہ دہلی کے شاعر غالبؔ کی ذوقِ سلیم سے گری ہوئی شاعری کا نمونہ ہے۔ اگر منیرؔ کا شعر لکھنؤ کی شاعری کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

ان کا یہ ارشاد بالکل صحیح ہے لکھنؤ کی شاعری سے مراد ناسخؔ کا رنگ ہے۔ ناسخؔ کی

انقلابی شاعری تھی جس کے متعلق تمام اُدبا اور نقادِ فن کا فیصلہ آپ گزشتہ اوراق میں پڑھ چکے ہیں کہ انہوں نے زبان کو اتنا صاف اور شستہ بنایا کہ وہ فارسی کا مقابلہ کرنے لگی اور شاعری کو مہذب اور شائستہ بنایا اور اس کو وسعت دی۔ اس کو فصاحت و بلاغت کے درجہ پر پہنچایا کہ ان سے پہلے کے اساتذہ نے ان کی پیروی کی۔ مصحفیؔ ایسے جگت اُستاد نے ان کی پیروی کا اقرار کیا ہے۔ ان کے حریف آتشؔ نے بھی ان کی پیروی کی ورنہ ان کا کلام میرؔ و سوداؔ کی زبان بن جاتا۔ دہلی میں غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ اور داغؔ نے ان کی تقلید کی جس کا اعتراف خود غالبؔ نے کیا ہے تو اکبرؔ الہ آبادی اور شادؔ عظیم آبادی اپنے کو ان کی پیروی سے کیوں کر محفوظ رکھ سکتے تھے۔ ہندوستان کا کوئی شاعر ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا جس نے ناسخؔ کے بعد ان سے پہلے کی زبان اختیار کی ہو۔ اب آپ کے سامنے ناسخؔ کا کلام پیش کرتے ہیں اس کے بعد دوسرے شعرا کے اشعار پیش کریں گے جن سے آپ کو لکھنؤ کی شاعری کا اندازہ ہو جائیگا کہ وہ کس درجہ کمال پر ہے۔

ناسخؔ

دل اس بت پہ شیدا ہوا چاہتا ہے　　　خدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہے

ہر ایک کی صدائے قدم رونق ہے دل　　　بہتر ہے مجھکو پاس ترے انتظار سے

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں　　　ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

محمد حسین آزادؔ کو کسی نے یہ قصہ گڑھ کے سنا دیا کہ ایک مشاعرے میں کسی لڑکے نے یہ شعر پڑھا تو ناسخؔ نے اپنی غزل پھاڑ کے پھینک دی۔ آزادؔ نے بغیر سوچے سمجھے یہ من گھڑت افسانہ آبِ حیات میں لکھ دیا حالانکہ یہ شعر ناسخؔ کے دیوان میں موجود ہے اور جب وہ لڑکا ایسا زبردست شاعر تھا تو وہ کہاں گیا اور اس شعر کے بعد اس نے کوئی شعر کیوں نہیں کہا۔

بھول کر او چاند کے ٹکڑے ادھر آجا کبھی / میرے ویرانہ میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی

بیخبر نشۂ ایجاد سے بے ہوش ہوں میں / خم گردوں بھی تھا جب سے کہ بے ہوش ہوں میں

آفتاب حشر بھی تارا ہے اسکی شام کا / گردش ایام میں صبح شب ہجراں نہیں

توقع ہے شب فرقت میں مجھکو صبح ہوئے گی / معاذ اللہ کتنا موت سے انساں غافل ہے

اس زبان اس انداز بیان اس مضمون آفرینی کو دیکھئے ایسے شعر پہلے نہیں کہے گئے۔ اگر دو ایک شعر ایسے کسی کے یہاں مل جائیں تو قبل و بعد کے بھونڈے بھدے متانت و فصاحت و بلاغت سے دور اشعار ملیں گے۔ پوری غزل صاف ستھری کہیں نظر نہ آئے گی۔ اب اور شعرا کا کلام سنئیے۔

آتش

آئینہ سامنے رکھتے تو غش آ جاتا / تم نے انداز نہیں اپنی ادا کا دیکھا

پھرا کا کیا مرقع عالم کے حسن پر / ہر روز عشق اک نئی تصویر سے ہوا

گستاخ بہت شمع سے پروانہ ہوا ہے / موت آئی ہے سر چڑھتا ہے دیوانہ ہوا ہے

کیا یہ ناسخ کی زبان و شاعری سے الگ میر و سودا یا مصحفی و انشا کے زمانہ کی شاعری ہے؟

سید مظفر علی اسیر

نبض بیمار کی اے رشک مسیحا دیکھی / آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی

اٹھنا انہیں منظور ہے پہلو سے ہمارے / حیلہ ہے کہ دیکھی نہیں جاتی تپش دل

مسجد سے نکل کر میں رہ بتکدہ بھولا / تقدیر نے رکھا نہ ادھر کا نہ ادھر کا

خدا جانے یہ کس کی جلوہ گاہ ناز ہے دنیا / ہزاروں اٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

یہ مصحفی کے شاگرد تھے مگر رنگ ان کا بھی ناسخ کا ہے۔

یہ تینوں بزرگ اپنے وقت کے مسلم استاد تھے ان کے بعد انہیں کے شاگردوں نے علم استادی بلند کیا مگر سب زبان و شاعری میں ناسخ کے پیرو تھے۔ اب ہر ایک کے چند شعر سنئیے۔

خواجہ محمد وزیر وزیر

تھام لوں دل کو ذرا ہاتھوں سے / ابھی پہلو سے نہ اٹھ جائیے گا

افزوں کہیں ہیں حسن میں شمس و قمر سے آپ / آئینہ لے کے دیکھئے میری نظر سے آپ

دل دیا اس کو پر یہ ڈرتا ہوں / دشمن اک دوست کے کیا ہمراہ

آگئی لغزش مستانہ کسی مست کی یاد / دور ساغر نے کیا بزم میں بیہوش مجھے

لکھ سکا خط میں نہ جب وصف صفائے رخ یار / دیدیا آخر میں دست نامہ بر میں آئینہ

تصویر کھینچ چکی تو لکھا حشر زیر پا / مانی سے جب کھنچا نہ وہ انداز چال کا

محمد رضا برق

کیا شوخیاں ہیں ابلق لیل و نہار کی / جمتی نہیں ہے ران کسی شہسوار کی

خدا غریب کی سنتا ہے غیب سے فریاد / اثر عجیب دل دردمند رکھتا ہے

میر علی اوسط رشک

ہم تجھ میں محو قدرت پروردگار ہیں / اک خشت خاک کو مہ انور بنا دیا

محفل میں شمع چاند فلک پر چمن میں پھول / تصویر روئے انور جاناں کہاں نہیں

مجھ کو بدنام کیا روح کا ہو جائے برا / کہ لب پیکر تصویر میں فریاد نہیں

اور آمد شد جاناں کے مشابہ کیا ہے / دم کو آتے کبھی دیکھا نہ نکلتے دیکھا

میر سیادت حسین عرف آغا مجو شرف

اس کو حیرت ہے اُدھر مجھ کو اِدھر سکتہ ہے
یار تصویر ہے آئینہ دیوار ہوں میں

جھٹپٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا
صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھہرا

داستانِ شبِ غم ہوش میں آؤں تو کہوں
دل سنبھالے مجھے میں دل کو سنبھالوں تو کہوں

پھڑک کے جان نہ دیتا تو آہ کیا کرتا
قفس سے اور نکلنے کی راہ کیا کرتا

شاخِ گل جھوم کے گلزار میں سیدھی جو ہوئی
پھر گیا آنکھ میں نقشہ تری انگڑائی کا

بے نیازی پہ اُنہیں ناز مرے دم تک تھا
لن ترانی کی نہ پھر آئی صدا میرے بعد

نواب سیّد محمد خان رندؔ

دید لیلیٰ کے لئے دیدۂ مجنوں ہے ضرور
میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا میرا

اجاڑا موسمِ گل ہی میں آشیاں میرا
الٰہی ٹوٹ پڑے تجھ پہ آسماں صیاد

اختیاری نہیں ہر بار ہے ایسی شکل
کھنچ گیا صانعِ ایجاد سے نقشہ تیرا

جام کو منھ سے لگانے کی نہ پہنچی نوبت
چشمِ مخمور نے ساقی کی یہ بے ہوش کیا

پھینک دوں گا میں ابھی چیر کے پہلو اپنا
تم پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

کسی کے وعدہ کا رہ رہ کے دھیان آتا ہے
اٹک اٹک کے نکلتی ہے انتظار میں روح

میر وزیر علی صباؔ

جنوں کا ولولہ موقوف ہے سیرِ بیاباں پر
الٰہی پھٹ پڑے سقفِ فلک دیوانۂ زنداں پر

بتوں کے عشق میں مجھ کو ہلاک کر ڈالا
یہ کیا مشیتِ پروردگار میں گزری

درازیِ شبِ تارِ لحد معاذ اللہ
بغیر صبحِ قیامت سحر نہیں ہوتی

گر محبت کا دل میں داغ نہیں
خانۂ کعبہ میں چراغ نہیں

میر دوست علی خلیل

لاکھ پردوں میں بھی ہو جاتا ہے وصلِ حسن و عشق
شمع کی روشن جہاں موجود پروانہ ہوا

اس درجہ ہوش اڑا دیئے جلوے نے یار کے
اُٹھا جو بزمِ یار سے وہ بے خبر اُٹھا

منھ نہ محشر میں بھی دکھلائیے گا
بھیڑ میں اور بھی شرمائیے گا

نہ مجھ سا بلبلِ شوریدہ سر ہوا پیدا
نہ تجھ سا گل چمنِ روزگار میں آیا

پنڈت دیا شنکر نسیمؔ!

لائے اس بُت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

جنبش ہوئی مژہ کو تو برہم ہوئے دو کون
ابروئے چشمِ یار کی ہر ایک جست ہے

جوہرِ تیغ نگہ کھل جائے گا
منہ نہ میرے زخم کا کھلوائیے

دوزخ و جنت ہے اب مری نظر کے سامنے
گھر رقیبوں نے بنایا اس کے گھر کے سامنے

سیّد مرزا تعشق

شعلۂ حُسن سے تھا دردِ دل اپنا اوّل
آگ دنیا میں نہ آئی تھی کہ سوزاں ہم تھے

برق رہ رہ کے چمکتی ہے تو میں کہتا ہوں
ہو غنیمت اگر اتنا بھی مرا دل ٹھہرے

افتادہ رہنے دی تھی زمیں دل کی اس لئے
اُمید تھی کہ آپ یہاں گھر بنائیں گے

دل جو مر جائے بیمار تو کرے کون آہیں
سو گیا جاگنے والا شبِ تنہائی کا

طوقِ منت کے گلے میں تھے وہ دن یاد کرو
تم پر اس عہد میں بھی چاک گریباں ہم تھے

اب اگر تخفیف ہوتی ہے تو گھبراتا ہوں میں
دردِ دل اتنے دنوں سے ہے کہ عادت ہو گئی

دیر تک روئی خوشی حسرت سے مجھ کو دیکھ کر
جب بنا ڈالی گئی میرے دلِ ناشاد کی

بجھ رہے ہیں داغِ دل تربت میں جلانے کیلئے
روشنی کم ہو رہی نیند آنے کے لئے

حکیم ضامن علی جلالؔ

وہ دل نصیب ہوا جس کو داغ بھی نہ ملا
نجات مل گئی ناصح سے عمر بھر کے لئے
کون ان سے کہے قصۂ شب تنہائی کا
کسی نے دے کے تسلّی ہمیں قیامت کی
اہلِ دل کے لئے راحت نہیں اس سے بڑھ کر
لٹک کے زلفیں جو آپڑی ہیں کمر کسی کی لچک رہی ہے
اکیلے کا کہیں دو سرکشوں سے زور چلتا ہے
جھک کے شرمائی نگاہیں کبھی اٹھتیں تو بھی
کیا لطف دے رہا ہے بگڑنا عتاب میں

ملا وہ غمکدہ جس کو چراغ بھی نہ ملا
اسی کو بھیج دیا یار کی خبر کے لئے
شمع خاموش کو یارا نہیں گویائی کا
کہ آج ہے جو تڑپ کل یہ اضطراب تھا
جسکو سمجھا ہے وہ بے درد دکھانا دل کا
بلا کی آئی ہیں دو گھٹائیں غضب کی بجلی چمک رہی ہے
دوپٹا لاکھ سینہ پر سنبھالو کب سنبھلتا ہے
آپ کو کیا جو زمانہ تہ و بالا ہوتا
لاکھوں بناؤ ہیں ترے ایک پیچ و تاب میں

علی میاں کاملؔ

یہ کرشمے نہ تھے ہر وقت کا یہ ناز نہ تھا
جا کے دیکھا اسے مرقع میں شبیہ یوسف
ہم نے دیکھا کہ قیامت کی تڑپ برق میں تھی
جا کے دیکھا تو عجب امن کا گوشہ تھا مزار
شرم کے پردے میں اب کرنے لگیں کام اپنا
میں نہ مانوں گا کہیں میرے جلانے کو رقیب
صفت عشوۂ جانانہ بھی تھا ناز بھی تھا

آپ کی آنکھوں کا آگے تو یہ انداز نہ تھا
ہم جس انداز کے خواہاں تھے وہ انداز نہ تھا
آپ کے جلوۂ جانانہ کا انداز نہ تھا
غم نہ تھا عیش نہ تھا سوز نہ تھا ساز نہ تھا
آگے ان نیچی نگاہوں کا یہ انداز نہ تھا
برق کے جلوہ میں اس شوخ کا انداز نہ تھا
سحر بھی آنکھ میں اس شوخ کی اعجاز بھی تھا

ایک خنجر بھی نہیں قتل کا میرے مجرم
ناوک مژگاں سلامت اس ستمگر کا رہے
بام پر کل جو یکایک وہ پری زاد آیا

ذبح کرتے ہیں شریف آپ کا اعزاز بھی
زخم اے کامل ہمارے دل کا بھر آیا تو کیا
شیخ کو شیخ برہمن کو خدا یاد آیا

اسمٰعیل حسین منیرؔ

بخت خفتہ کا ٹھکانا کوئے جاناں میں نہ تھا
ہو گئے محجوب تم کو دیکھ کر خوبانِ دہر
کہئے کس پتھر سے جا کر کعبہ میں سر پھوڑتے
افسانۂ شباب خدارا نہ پوچھئے
روپوش نور و نار تھے ان کے شباب میں
کیا کرتے مفلسی میں جوانی کی دعوتیں
نیند کی راہ مری آنکھوں کو معلوم نہ تھی
سن کے شہرہ تری رفتار کا آگے نہ بڑھا
کرتی جو مہ مصر کی تعریف زلیخا
نام اس شوخ کا حسن کریم ملک کہتے ہیں

خواب غفلت کا گزر چشم نگہباں میں نہ تھا
کون سا سر تھا جو آغوش گریباں میں نہ تھا
ایک بت بھی قبلہ ارباب ایماں میں نہ تھا
دیکھا ہے جاگتے ہیں جیسے یہ وہ خواب تھا
بادل میں چاند زیر زمیں آفتاب تھا
مہماں اجڑے گھر میں ہمارا شباب تھا
اے خدا خواب اجل ہجر میں کیونکر آیا
جب دبے پاؤں کہیں فتنۂ محشر آیا
تصویر دکھا دیتے ترا نام نہ لیتے
یہ شرر دیکھئے کیوں کر گلِ آدم میں ہے

مہدی حسین ماہرؔ

کیوں نہ تڑپائیں مجھے سوز الم میں آہیں
اللہ ری شرم آئی جو تصویر بھی مری
لاکھ کوئی کہے پتلی کی ادائیں ہیں گواہ
پھیلائے پاؤں سوتے ہیں تکیہ پر سر نہیں

کون شعلہ ہے جو بیتاب ہوا ہے نہ ہوا
آنکھوں پہ ہاتھ رکھ دیئے فرط حجاب میں
نشہ آنکھوں میں جوانی کا ہے مخمور نہیں
کیا کر رہی ہے کس کی نظر کچھ خبر نہیں

قیامت کے جب آنے میں نظر آتی ہے ویراں کو
زمیں سے چلنے میں کھینچتا ہو دامن اٹھاتے ہیں

یہی تو ہیں ادائیں قتل کرتی ہیں جو محفل کو
کہ خود بیٹھے ہیں اور تصویر پوشیدہ ہے دامن میں

پوچھی جو مجھ سے قیس نے سختیٔ راہِ عشق
تلووں کے کانٹے رکھ دیئے سر سے نکال کے

کہاں یہ چال کہاں خفتگانِ خاک کے دل
خدا کسی کو تمہاری طرح جواں نہ کرے

جان ڈالے قالبِ بے جاں میں گر قدرت تری
رنگ دوڑے خون بن کر پیکرِ تصویر میں

للہ خبر لیجیو دل کی شباب میں
تاریک شب ہے اور کوئی پاسباں نہیں

جاگے ہیں رات بھر وہ اسی اضطراب میں
وہ دیکھتا نہ ہو مری صورت کو خواب میں

کان میں مردوں کے بھی جانے لگی آوازِ پا
روکئے حد سے گزرتی ہے جوانی آپ کی

سبب یہ تھا کہ جو مستوں میں انقلاب آیا
جدھر وہ آنکھ پھری ساغرِ شراب آیا

خدا کی شان کہ شرم آئی عکس آئینہ سے
وہ اجنبی ہوئے خود سے بھی جب شباب آیا

ہم تو واقف بھی نہ تھے حشر سے اس سر کی قسم
آپ آئے تو یہ سمجھے کہ قیامت آئی!

قبا مسکی پسینہ آگیا گرمی سے اُف اُف کی
لگایا جب گلے اچھی طرح ان کو جوانی نے

منشی امیر احمد امیر مینائی

ترے بندوں سے کرتے ہیں یہ بُت دعویٰ خدائی کا
تماشا دیکھتا ہوں تیری شان کبریائی کا

مرے ہی سامنے دامن اُٹھا کر ناز سے چلنا
مجھی سے پھر گِلا الٹا مرے چاک گریباں کا

داورِ محشر کو بھائی میری ان کی چھیڑ چھاڑ
چھیڑ کر پوچھا مکرّر کیا ہوا کیوں کر ہوا

تم کو آتا ہے پیار پر غصّہ
مجھ کو غصے پہ پیار آتا ہے

بڑھ جاتی ہے چمن میں اور آرزو تمہاری
جس گل کو سونگھتا ہوں آتی ہے بو تمہاری

خواہشِ وصل تو کیونکر کہوں لیکن ناصح
دیکھ لینے کا تو حضرت کو بھی ارماں ہو گا

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی
وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

شکوہ کسی سے دل شکنی کا کروں میں کیا
یہ شیشہ چوٹ کھانے سے پہلے ہی چور تھا

آفت کی شوخیاں تمہاری نگاہ میں
محشر کے فتنے کھیلتے ہیں جلوہ گاہ میں

پیارے صاحب رشیدؔ

نہیں ہے جس میں تیرا عشق وہ دل ہے تباہی میں
وہ کشتی ڈوب جائیگی نہ جس کا ناخدا ہو گا

اپنے گناہ دیکھ کے دفتر میں روزِ حشر
ہنگامہ ہوا و ہوس یاد آگیا

صد پارہ ہو کے پھیل گیا ہے ہمارا دل
شیرازہ کُھل گیا ہے وفا کی کتاب کا

تنگ آکے میں نے خاک کا پردہ کیا قبول
انجام یہ ہوا ہے تمہارے حجاب کا

صبر لازم تھا مجھے اور ظلم کرنا تھا تمہیں
یہ لباس عشق تھا وہ حُسن کی پوشاک تھا

مانگی اجازت اور تری آنکھوں سے لی مدد
عالم نے جب ارادہ کیا انقلاب کا

محشر میں ہے سوال گناہ و ثواب کا
یہ ذکر ہو رہا ہے شباب کا

محو وہ زلفیں بنانے میں ہیں پروا بھی نہیں
کس کا بگڑا حال کس کا دل پریشاں ہو گیا

لحد میں کیسا کیسا دم گھٹے گا ایک مدت تک
نئی بستی نئی پوشاک ہو گی گھر نیا ہو گا

آج ہم روئے بہت دیکھ کے تصویرِ شباب
یاد تازہ ہوئی بھولے ہوئے افسانوں ا

بندہ کاظم جاوید

نشہ آنکھوں میں بل ابرو پہ ہے اور لب پہ ہنسی
ہے سلیقہ انہیں تصویر کے کھنچوانے کا

یہ آرزو ہے کہ بڑھ جائے طاقتِ پرواز
پھڑک رہا ہوں لہو بازوئے کبوتر پہ

آج کے دن کی خبر دل کی دھڑکن دیتی تھی
بچپنے میں کبھی سنتے تھے جو افسانۂ عشق

پاس آتے ہیں وہ ہمراہ رقیب اے جاوید
اب اگر آج اجل آئے تو کچھ دُور نہیں

آئے ہیں لے کے غیر کو وہ پوچھنے مزاج
کیونکر کہوں کہ شکر ہے پروردگار کا

محل ملانہ مجھے حشر میں جو نالوں کا
بحال ہو گیا چہرہ ستانے والوں کا

رات کو دریا کی موجیں کس طرح سے چین لیں
اک کنارے چاند ہے اور اک کنارے آپ ہیں

ہوتا ہوں قتل اُن کی نزاکت کو دیکھ کے
کھنچتی نہیں ہے ہاتھ سے تلوار کیا کریں

کچھ خون گرم پھر کسی گوشہ میں رہ گیا
روشن چراغ ہے دلِ امیدوار میں

جانکنی کا وقت ہے کروٹ بدلنے دیجئے
آپ کی حسرت نہیں دم ہے نکلنے دیجئے

بجلی گرے گی آج کسی بد نصیب پر
ہم نے کلیجہ تھام لیا مسکرا دیئے

غیر کہتے ہیں ترس کھا کے مری حالت پر
ان کو سینہ سے لگا لو نہیں تو مر جائیں گے

کیا ہمیں کیا نہ کہیں ہجر کی ایذاؤں کو
اب اگر موت نہ آئے گی تو مر جائیں گے

شانہ کش ہیں غیر آئینہ ہے پیشِ روئے دوست
کس شکنجہ میں کھنچی ہے قسمت گیسوئے دوست

مرزا محمد ہادی مرزا (رسوا)

لذتِ معصیت عشق نہ پوچھ
خُلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

حضرت ناصح نہیں ممکن مری وحشت کا ساتھ
دشت میں چاک گریباں آپ سینے جائیں گے

زندگی، دولت، جوانی، بے خودی شوق وصال
پھر ملیں گے بھی جو یہ سامان جینے جائیں گے

موت ہی کو زندگی کہنا اگر ہے رسم عشق
مرنے والے آپ کے قبروں میں جینے جائیں گے

آئینے سے ہے انکا ردو بدل
تنگ ہیں شوخیٔ مقابل سے

وضع کے پابند ہم دیوانگی جدت پسند
پھر گلایا جائے لوہا قیس کی زنجیر کا

جان دینا کسی پہ لازم تھا
زندگی یوں بسر نہیں ہوتی

شوق اظہار اگر ہے تو مرے دل کو نہ توڑ
اسی آئینہ میں تو جلوہ نما ہوتا ہے

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی
اسی کافر کی ادا یاد آئی

منشی نوبت رائے نظر

گردشِ دہر بھی اک گردشِ پیمانہ ہے
ذرہ ذرہ میں ترا جلوۂ مستانہ ہے

اک طبیعت کی اُداسی کا اثر اتنا ہے
ساری دنیا نگہِ یاس میں ویرانہ ہے

حالتِ محفلِ عشرت ہے رقم سب اُسمیں
ایک دفتر کے برابر پر پروانہ ہے

پرتوِ مہر کجا ذرہ ناچیز کجا
کیوں یہ دل حسرتیِ جلوہ جانانہ ہے

ترے ملنے کی وہ تقریب جو ہے یاد اب تک
جس سے کہتا ہوں وہ کہتا ہے کہ دیوانہ ہے

دل کی حالت نہیں سنبھلنے کی
اب یہ دنیا نہیں بدلنے کی

دل سوزاں کو شمع کیا کہتے
اُس کو حسرت کہاں ہے جلنے کی

ہم ہیں مجبور زندگی معذور
دم میں طاقت نہیں نکلنے کی

میں کہاں اور خیالِ دوست کہاں
ایک صورت ہے جی بہلنے کی

پنڈت برج نرائن چکبست

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا
اجل کیا ہے خمار بادہ ہستی اتر جانا

اگر درد محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا
نہ مرنے کا الم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

درد الفت آدمی کے واسطے اکسیر ہے
خاک کے پتلے اسی جوہر سے انساں ہو گئے

ہوس جینے کی ہے یوں عمر کے بیکار کٹنے میں
جو ہم سے زندگی کا حق ادا ہوتا تو کیا ہوتا

وہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انسان سہتا ہے
نہیں تو ہے بہت آسان اس جینے سے مر جانا

جہاں میں رہ کے یوں قائم ہوں اپنی بے ثباتی پر
کہ جیسے عکس گل رہتا ہے آب جوئے گلشن میں

مرے احباب پیش آتے ہیں مجھ سے بے وفائی سے
وفاداری میں شاید کر رہے ہیں امتحاں میرا

ہائے اس دنیا کی پابندی عجب دلگیر ہے
خود پہنتا ہے جسے انساں یہ وہ زنجیر ہے

مزا شباب میں ہے سر سے خوں بہانے کا — لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے
دفتر جس پہ مہر ید قدرت سمجھو — پھول کا خاک کے تودے سے نمایاں ہونا
اپنا ہی دم ہوا ہے گلو گیر وقت نزع — غیروں کا زندگی میں ہو پھر اعتبار کیا

مولانا علی نقی صفی

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا — ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا
تو بھی مایوس تمنا میرے انداز میں ہے — جب تو یہ درد چھپے تری آواز میں ہے
راہ طلب میں نفس حریفانہ ساتھ ہے — ہشیار اک ذرا سگِ دیوانہ ساتھ ہے
دنیا کا ورق دیدۂ اربابِ نظر میں — اک تاش کا پتہ ہے کفِ شعبدہ گر میں
کل ہم آئینہ میں رخ کی جھریاں دیکھا کئے — کارواں عمر رفتہ کے نشاں دیکھا کئے
وہاں شانہ کشی ہے گیسوؤں کا خم نکلتا ہے — یہاں رگ رگ سے پیچ کھینچ کر بیمار دم نکلا
بکھری ہیں یوں پتلیاں شب غم کی شام ہی سے سحر ہوئی ہے — مگر نہ آنا تھا وہ نہ آئے ادھر کی دنیا ادھر ہوئی
کم بخت بڑھ روز قیامت سے مل گئی — دیکھا فریب تم نے شب انتظار کا
رفتہ رفتہ روح شاید کھچ رہی ہے سوئے دوست — دے رہا ہے میرے ماتھے کا پسینہ بوئے دوست
ہنس پڑے قاتل الٰہی شکوہ بیداد پر — فیصلہ محشر میں ہو جائے اسی روداد پر
دم آخر کسی کا ہچکیاں لینا یہ کہتا ہے — کچھ آہیں دل میں شاید رہ گئی تھیں نارسا ہو کر
دیکھ لوں دور سے تصویر شباب رفتہ — رخ ادھر بھی کبھی اے عمر گریزاں کرنا

مرزا محمد ہادی عزیز

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن — بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا
دل نہ ہوتا جب بھی تیرا عشق ہوتا روح کو — اس گرہ نے اور اس رشتہ کو محکم کر دیا

[illegible] نے سر فرد جمال — اپنے عالم میں ترے دیدہ مخمور نہیں
[illegible] ذوق زندگی ہی تھی — عزیز اُن کے جو وعدہ کا انتظار کیا
[illegible] اے جلوہ طور — کس طرح تو نے چھپایا ہے نمایاں ہونا
[illegible] ہوگی اپنے حسن روز افزوں کی — اگر وہ سلسلہ سے میری تصویر دیکھیں گے

ایک دن میں نے عزیز صاحب سے پوچھا کہ آپ کو اپنا کون سا شعر زیادہ پسند ہے۔ فرمایا:۔

دل [illegible] بنا ڈالی — اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی

حالانکہ اس غزل میں ان کا ہر شعر مجھے اس سے زیادہ پسند ہے۔

[illegible] کاٹنے والے — کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی

سید انور حسین آرزو

[illegible] اُف ترے وحشی کا جھنجھنا — بند اپنے ہاتھ سے در زنداں کئے ہوئے
[illegible] ہم نے نہ کچھ اس نے سنی ہے — چتون ہے کہ تلوار لئے سر پہ کھڑی ہے
[illegible] آنکھوں کا ہے کہنے کو ذرا سا پانی — کتنے ہی ڈوب گئے پھر بھی ہے اتنا پانی
[illegible] ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی — جھوم کے آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی
[illegible] کی لاگ میں [illegible] ادھر سے ہوتی ہے — شمع کا شعلہ جب لہرایا اڑ کے چلا پروانہ بھی
[illegible] نے ڈوبی عمر کی کشتی — آج پایا نشان ساحل کا
[illegible] میں دل ہے تو بار محبت — اُٹھے یا نہ اُٹھے اٹھانا پڑے گا
[illegible] دل مجھ سے نہ پوچھ — ملا کے خاک میں ہم کو گئی باد کہاں
[illegible] جنبشوں میں بھی لہریں تھیں حسن کی — جو دیکھنا تھا اہلِ نظر دیکھتے رہے

مرزا ذاکر حسین ثاقب

بڑھائے حوصلے دریا دلی نے ساقی کی
ذرا سے جام میں سو بار آفتاب آیا

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے

سنائیں کیا انہیں نیرنگِ عشق کا قصہ
تمام عمر نہ آنکھیں کھلیں نہ خواب آیا

حُسن کے ہاتھ بندھے تو وہ ذرا دیر سہی
مجھ پہ احساں تری آئی ہوئی انگڑائی کا

آئینہ جس میں سدا ڈوب کے اُبھرا کیا حُسن
ایک ٹھہرا ہوا پانی ہے خود آرائی کا

اُن کی بزم میں ناز میں تو سانس بھی دل نے نہ لی
نالہ کش برسوں کا اک تصویر بن کر رہ گیا

جلوۂ حُسن اک اشارے میں بہت کچھ کہہ گیا
میں نہیں سمجھا مگر ہاں دل تڑپ کر رہ گیا

مری قید کا دل شکن ماجرا تھا
بہار آئی تھی آشیاں بن چکا تھا

مری داستانِ غم کو وہ غلط سمجھ رہے ہیں
کچھ انہیں کی بات بنتی اگر اعتبار ہوتا

مرزا جعفر علی خان اثر

کوئی دل پر ہاتھ رکھ کے اُٹھ گیا
ہاتھ اب دل سے اٹھاؤں کس طرح

نقابِ رُخ سے اگر اٹھائی تو منہ کو ہاتھوں سے کچھ چھپایا
ادا نے بجلی گرائی دل پر حیا نے صبر و قرار لوٹا

بہک کے تم نہیں مسجد کو سمجھا میخانہ
غضب ہوا تھا مرا سر یہیں جھک گیا ہوتا

کون یہ ہم کلام تھا ہم سے
ہائے کوئی تو آس پاس نہیں

بے ربط ہو گئی تھی عبارت کہیں کہیں
کافر نے نقل کی وہی مرے جواب میں

صحرا کوئی نہیں ہے ہمارے مذاق کا
بیٹھے ہیں اپنے گھر کو بیاباں کئے ہوئے

برق شرمندہ ادھر، ہم ہیں پشیماں اُدھر
چار تنکوں کے سوا خاک نشیمن میں نہیں

[illegible] گیسو کا نتیجہ یہ ہے
آئینہ خانہ میں لیتے ہیں بلائیں اپنی

ہوش مرے اُڑ گئے جب یہ سُنا
حشر میں دیدار اُن کا عام ہے

[illegible] کی آگ میں جلنا بھی جلنا ہے کوئی
بجھتے بجھتے کہہ گئی یہ شمع پروانہ سے کیا

[illegible] بیکار ادھر قفس خالی
سمجھ میں آئی ضرورت اب آشیانے کی

[illegible] کا کلام نہیں مل سکا اور ان کا کوئی شعر یاد تھا وہ بھی حاضر خدمت ہے۔

[illegible] ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں ([illegible])

[illegible] فریاد کی ہے
گھُٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے (میر مونس)

[illegible] ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گئے (”)

[illegible] صبا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مُرجھا گئے (وزیر علی صبا)

[illegible] ہنس ہنس کے
اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

[illegible] اُٹھے
پریشاں زلف ماتھے پر شکن بگڑے ہوئے تیور (مرزا کاظم حسین محشر)

[illegible] ہوش نہیں
لُٹ رہا ہے مرا گھر اور مجھے ہوش نہیں (مہدی حسین ناصری)

[illegible] لکھوا دو
طول کھینچا ہے یہاں تک شبِ تنہائی نے (”)

[illegible] نام تھا
وہ ہنسی روکے ہوئے بیٹھا تھا جس کا کام تھا (جعفر حسین منظر)

[illegible] پانی میں
ایسی تمناؤں سے کھیل کے ہم پچھتائے بہت (آل رضا رضا)

[illegible]
کہ دل کی چوٹ بھی ایذا نہیں دیتی جوانی میں (سجاد حسین تمنا)

[illegible] وقت
آ چکا اب اُن کا دامن میرے رخسار کے پاس (”)

[illegible] شاعر شاد عظیم آبادی جن کے بعد ان کی نظر میں کوئی [illegible] غزل ہے جس کے دو شعر یہ ہیں:۔

[illegible] معلوم
یہ کس گناہ کی پاداش ہے خدا معلوم

[illegible]
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

اس رنگ میں جناب اثر لکھنوی کے چند شعر ملاحظہ کیجئے:۔

فنا پہ جس کی بقا ہے وہ ہے بقا میری
یہ ابتدا ہے تو کیا ہوگی انتہا میری

نہیں کھلتا نہیں کھلتا فریب ہستی فانی
کہاں سے آئے کیوں آئے کہاں ہم جانے والے ہیں

اُس طرف صحرائے امکاں اِس طرف دشت عدم
اک ویرانے کو بدلا ایک ویرانے گیا

زندگی اک خواب تھی خواب ہی میں بسر ہوئی
کھلتے ہی آنکھ بند تھی کچھ نہ کھلا کہ آئے کیوں

نہ تحقیق منزل نہ راہوں سے واقف
چلے جا رہے ہیں چلے جانے والے

نہیں شرط ابتدا کی نہیں قید انتہا کی
ہے لطیف قصۂ غم اسے چھیڑ دو جہاں سے

جس قدر غور کروں دل میں الجھتا ہوں میں
کوئی حل ہی نہیں جس کا وہ معمے ہوں میں

سمجھ میں کچھ نہیں آتا طلسم بود و نبود
نہ تھا تو کیا تھا اثر اور ہوں تو کیا ہوں میں

جہاں نہیں ہے جہاں اُس جہاں سے آئے ہیں
ہم آستانِ بت بے نشاں سے آئے ہیں

یہ ہے لکھنؤ کی شاعری جو صرف غزل گو شعراء کے کلام سے پیش کی گئی ہے زندگی کے پیچ و خم اور تلخ حقیقتیں پیش کرنے کے لئے ضرب المثل کے طور پر روزمرہ کی گفتگو میں۔ بے تکلف زبان پر آجاتے ہیں۔ انسانی نفسیات کے نازک پہلو وجدان اور جمالیاتی احساس کی گہرائی ہے۔ حیات و کائنات کے مسائل ہیں۔ حُسن و عشق کی داستانیں ہیں۔ انداز بیان شاعرانہ ہے لہجہ میں زندگی کی تڑپ ہے۔ زبان میں فصاحت اور بیان میں بلاغت ہے۔ روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی ہے۔ تشبیہوں اور استعاروں کی ندرت ہے صنائع و بدائع کے التزام کے باوجود شاعر کی آواز کہیں دبی نہیں خیال کا بہاؤ کسی نقطہ پر ٹھکنے نہیں دیتا کہ یہاں کون سی صنعت ہے۔ الفاظ نے اپنی صناعانہ حیثیت کو الگ قائم نہیں کیا بلکہ شاعر کی آواز کو تیز کرنے میں نغمہ و آہنگ اور اُس کے جذبات کے نقوش ابھارنے میں آب و رنگ کا کام کیا۔ یہ مشاہیر کا کلام ہے۔ لکھنؤ وہ شہر ہے جس کے

نوے فیصد باشندے شعر کہتے ہیں اور سو فیصدی سخن فہم اور قدردان سخن ہیں۔ اکثر عورتیں بھی شعر کہتی ہیں:۔ جہلاء بھی پڑھے لکھوں کی طرح سے سخن فہم ہیں اچھا اثر شاعری کا ہے۔ جن لوگوں نے لکھنؤ میں رہ کر کچھ سیکھا ہے وہ کہتے ہیں ؎

ظہیر اس شہر میں اوج کمال نظم تک پہنچا
الٰہی لکھنؤ بھی عرش ہے مضمون عالی کا

اور جنہوں نے لکھنؤ کو دیکھا ہے وہ کہتے ہیں:۔

مدام لکھنؤ رہے آباد یا الٰہی
مجمع ہے اس دریا میں اہل کمال کا

شاد عظیم آبادی فرماتے ہیں:۔

کوئی جگہ کوئی صحبت نہیں کہ ہوں نہ وہاں
مورخ و شعراء و ادیب و اہل کمال

مولانا حالی شاعری کے متعلق کہتے ہیں:۔

؎ تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا ہے

اہل کمال لکھنؤ برف دان تھے اور لکھنؤ اہل کمال پہ اگر مقالہ نگار کو اب سو میل دور بیٹھ کے لکھنؤ میں ہُو کا عالم نظر آتا ہے اور جاہلانہ لاف زنی کی وبا پھیلی اتفاق ہے تو میں اُن کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میرا سن ۲۷ برس کا ہے اور موصوف ۶۰ کی حد میں داخل ہو چکے ہیں اُن کے سن کا احترام مجھ پر لازم ہے آپ جو رائے چاہیں اُن کے متعلق قائم کریں۔

(۸) کیا لکھنؤ کا علمی سواد جونپور کا فیض و صدقہ ہے فاضل مقالہ نگار نے جونپور کی عظمت دیرینہ کی داستان جس بلند آواز اور فخر کے لہجہ میں بیان کی ہے وہ اُن کے جذبۂ وطن پرستی کی قابل ستائش کوشش ہے۔ جس پر کسی کو بُرا ماننے کی کوئی وجہ نہیں خود لکھنؤ کے مایہ ناز شاعر مولانا شبلی نے جونپور کی تاریخی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

جونپور اے مولد سلطان عادل شیر شاہ　　تیرے آثار قدیمہ تیری عظمت کے گواہ

ذاتی طور پر مجھے جونپور سے جتنا اُنس ہے اتنا کسی شہر سے نہیں اپنی عمر کا بڑا حصہ میں نے وہیں گزارا ہے اور اب تک۔ بقول

وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے

موصوف کا یہ ارشاد کہ لکھنؤ کا علمی سواد بزرگان جونپور کا فیض و صدقہ ہے اگر صحیح ہوتا تو اس کے ماننے میں کوئی عذر نہ تھا۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ علم کا فیض پہنچتا ہی ہے۔ چراغ سے چراغ ہمیشہ جلتا آیا۔ لکھنؤ میں علوم و فنون زمین سے نہیں نکلے۔ مختلف جگہوں کے علماً فضلا نے آباد ہو کے اُسے مرکز بنا دیا۔ اس میں اگر جونپور کا بھی کچھ حصہ ہو تو بُرا ماننے کی کیا وجہ؟ جون پور میں بھی تو فیض کہیں سے پہنچا ہی ہوگا۔ اسی طرح خاندان اجتہاد یا فرنگی محل کے علماً نے مختلف جگہوں کے اہلِ علم سے تحصیل کی اگر جونپور کے بھی کسی عالم سے پڑھا ہو تو انکار کے کیا معنی؟ مگر چونکہ یہ واقعہ نہیں ہے اس لئے اس کا تسلیم کرنا حقیقت کے خلاف ہوگا۔

موصوف کہتے ہیں کہ سیّد عسکری صاحب جون پور کے ایسے عالم متبحر تھے جن کی قابلیت کا شہرہ کابل و قندھار تک تھا۔ اُن کی فراست کا یہ علم تھا کہ شیخ علی حزیں کا جواب بغیر خط پڑھے لکھوا دیا۔

(خط کا مضمون بھانپ لیتے تھے لفافہ دیکھ کر)

بانیٔ خاندان اجتہاد حضرت غفرانمآب انہیں کے درس سے فیض پا کر عراق تشریف لے گئے اس کا ماخذ اُنہوں نے اخبار الناطق سنہ ۱۹۱۹ء بتایا ہے۔ افسوس کہ موصوف نے یہ حوالہ غلط دیا۔ اس میں کہیں اس کا ذکر نہیں شاید انہیں یہ خیال ہو کہ اتنے دنوں کا اخبار کسے ملے گا جو حوالے کی صحت پر گفتگو کر سکے گا "مگر جو بزدہ یابندہ"

اخبار میرے پیش نظر ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ جس مضمون میں جناب غفرانمآب کے حالات ہیں اس کی سُرخی تذکرۃ السلف ہے جو موصوف نے نہیں لکھی شاید اُنہیں یاد نہیں رہی اس میں کہیں اس کا ذکر نہیں ہے کہ جناب غفرانمآب نے سید عسکری صاحب سے جون پور جا کر پڑھا اور صرف اسی اخبار میں نہیں بلکہ آج تک تاریخ و سیر کی بہت سی کتابوں میں جناب غفران مآب کے حالات جس قدر تفصیل سے ممکن تھے لکھے گئے۔ خود اُنکی زندگی میں آئینۂ حق نما آپ کے حالات میں ضخیم کتاب لکھی گئی اُس کے بعد سفر العادۃ تذکرۃ العلماً۔ نجوم السماً۔ اوراق الذھب مراۃ الاحوال۔ مراۃ البلاد۔ شذور العقیان۔ سبیکۃ الذھب تذکرۂ علمائے ہند۔ دوحہ ہاشمیہ۔ ورثۃ الانبیا۔ تذکرہ خاندان اجتہاد الحصول المنیع الی تراجم علمائے شیعہ۔ اعیان الشیعہ۔ تراجم علمائے شیعہ فی الہند تاریخ العلماً نزہۃ الخواطر ان سب میں بعض کتابیں عراق و ایران میں لکھی گئی ہیں کسی میں اس کا ذکر نہیں کہ اُنہوں نے سفر عراق سے پہلے جون پور کا سفر کیا اور وہاں سید عسکری صاحب سے تحصیل کی حالانکہ تحصیل علم میں ان کی کاوش اور ان کے اساتذہ کے نام بڑی تحقیق سے لوگوں نے لکھے ہیں۔ پھر جب سید عسکری صاحب کی شخصیت پر نظر کی جاتی ہے تو تذکرۂ علمائے ہند سے پتا چلتا ہے کہ اُنہوں نے باقاعدہ تحصیل علم نہیں کی تھی صرف قوت مطالعہ سے عربی کتابیں سمجھنے کے لئے قابلیت پیدا کی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان میں تدریس کی وہ لیاقت کہاں سے آ سکتی ہے کہ غفرانمآب ایسا بزرگ مرتبہ عالم ان سے تحصیل علم کرے اور درجۂ کمال پر پہنچے۔ یہ حقیقت ہے علمی فیض کی اور نتیجہ ہے اُسی طبیعت کے جوش و دماغ کی بے اعتدالی اور الفاظ کی بے احتیاطی کا۔　　اگر موصوف میری جگہ ہوتے تو اسے جاہلانہ غرور اور لاف زنی کہتے۔

آخر میں فاضل مقالہ نگار کہتے ہیں کہ اب لکھنؤ میں کچھ نہیں رہا۔ یہ خوان یغما

دوسرے لے گئے۔ اب تو پنجاب اور دکن زبان کے مرکز ہیں۔ دکن میں جو علمی اصطلاحیں وضع ہو رہی ہیں۔ اُن کو اہلِ لکھنؤ بھی استعمال کرتے ہیں۔

ابھی فاضل مقالہ نگار کہہ چکے ہیں کہ لکھنؤ میں جاہلانہ غرور اور لاف زنی کی وبا کے سوا کچھ نہ تھا۔ اب فرماتے ہیں کہ تھا مگر دوسرے لے گئے۔ حافظہ کا یہ قصور نیا نہیں ہے۔ نہ ہم اس کی گرفت کرنا چاہتے ہیں لیکن پنجاب اور دکن کی مرکزیت کا دعویٰ مدعی سست گواہ چست کی حیثیت رکھتا ہے۔

پنجاب میں لکھنؤ کی زبان

اس میں شک نہیں کہ پنجاب نے اردو کی اشاعت میں جو نمایاں حصہ لیا اُس کا اعتراف نہ کرنا ناانصافی ہے۔

حالی و آزاد کی سی ہستیاں پنجاب ہی نے پیدا کیں اور اس پُر آشوب زمانے میں اردو کی شمع کو وہی چراغ زیرِ دامن بنائے رہا اور زبان کے لئے کوئی علیحدہ معیار نہیں بنایا حالانکہ پنجابی زبان کے رواج اور استعمال کے باعث لکھنؤ کی اردو کی متابعت بہت مشکل تھی پھر بھی لکھنؤ کی زبان کو معیاری سمجھا اور کتابت میں اپنے تلفظ اور محاوروں کو نظر انداز کر کے لکھنؤ کے محاوروں کی پیروی کی اور جس دن اپنے الفاظ اور محاورے داخل کئے اسی دن ایک دوسری زبان بن جائے گی۔

لکھنؤ کی زبان دکن میں

دکن میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ ڈیڑھ سو برس اُدھر کی ہے۔ تم ان سے بولو۔ میں سنا ہوں۔ آپ کو کیا ہونا ہے؟ کتنا ہونا ہے؟ بیگم صاحب گئے۔ باتاں کرو۔ کبوتر کے پراں کاٹ دو۔ پکوڑے کھاتے۔ ہم قدر کی نگاہ سے دیکھتے۔ خاص و عام سب کی زبان پر ہے۔ اور آپس کی خط و کتابت تک میں ایسے محاورے آجاتے ہیں مگر ادبی تحریر لکھنؤ کی زبان میں ہوتی ہے اور جس دن انہوں نے اپنے کو زبان کا مالک سمجھا اور اپنے محاورے داخل کئے

اسی دن زبان دو سو برس پیچھے ہٹ جائے گی۔ یہ لکھنؤ کی زبان کی خوبی ہے کہ جو اس کی پیروی نہ کرے اُس کی زبان فصاحت کے درجے سے گر جائے اس مجبوری سے عملاً سب کو مرکز ماننا ہی پڑتا ہے۔ خواہ زبان سے اقرار نہ کریں۔

وضع اصطلاحات

موصوف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وضع اصطلاحات بڑی قابلیت اور لیاقت کا کام ہے جو دکن میں ہو رہا ہے اور اہلِ لکھنؤ میں یہ صلاحیت نہیں وہیں کی وضع کی ہوئی اصطلاحیں وہ بھی صرف کرتے ہیں۔

موصوف کو یہ نہیں معلوم کہ دکن میں واضع اصطلاحات لکھنؤ کے مایہ ناز فرزند مرزا محمد ہادی صاحب مرزا اور مولانا علی حیدر نظم طباطبائی تھے۔ اُن دونوں بزرگوں کے بعد یہ کام رک گیا کیونکہ ہندوستان میں کوئی اُن بزرگوں کا ایسا نہیں ملا۔

فاضل مقالہ نگار نے جو دلیلیں پیش کی ہیں وہ پانچ قسم کی ہیں۔

(۱) معقول (۲) نامعقول (۳) غلط (۴) اُلٹی (۵) مُضحک۔

جو ذیل میں سلسلے وار پیش کی جاتی ہیں۔

معقول دلیلیں

وہ لفظیں اور محاورے جو دہلی میں مستعمل تھیں اور لکھنؤ میں متروک ہیں ان کو آتش اور دبیر نے استعمال کیا ہے اس پر ہم نے کتاب کے تیسرے باب میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

نامعقول دلیلیں

"شعرائے دہلی عربی فارسی لفظوں میں ایطائے خفی کو جائز سمجھتے ہیں اور شعرائے لکھنؤ جائز نہیں سمجھتے۔ آتش اور دبیر کے یہاں ایسی مثالیں موجود ہیں"

یہاں بھی دھوکہ ہوا شعرائے لکھنؤ کے یہاں بھی ایسی مثالیں موجود ہیں اور عربی فارسی لفظوں میں بھی ہیں۔ اس قاعدے سے انکار نہیں مگر اس کی پابندی

لکھی گئی ہے ناسخ کے مایہ ناز شاگرد خواجہ وزیر کا شعر ہے۔

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہو کر
زمیں کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر

(۳) غلط یا اُلٹی دلیل

آتش کی زبان و شاعری کو دہلوی ثابت کرنے کے لئے ان کا یہ مصرع پیش کیا ہے۔ ؎

چاندنی راتیں یکایک ہو گئیں اندھیاریاں

اس مصرع میں اندھیاریاں پر لکیر کھینچ کے یہ بتایا ہے کہ یہ ترکیب دہلی کی ہے لیکن اسی مثال سے آتش کی زبان لکھنوی ثابت ہو گئی۔ "اندھیاری" خاص لکھنؤ کی زبان ہے۔ دہلی والے اس کو غلط سمجھتے ہیں۔

مولوی محمد حسین آزاد لکھتے ہیں :۔

اگرچہ دلّی میں بچے سے بوڑھے تک اندھیری رات کہتے ہیں مگر لکھنؤ والوں کو ٹوکنے کا مُنہ نہیں۔ کیونکہ جس خاک سے ایسے باکمال اُٹھیں وہاں کی زبان خود سند ہے۔ (آبِ حیات ص ۲۷)

اور اتفاق سے یہی مصرع مثال میں پیش کیا ہے کیونکہ وہ آتش کو لکھنوی سمجھتے تھے اور باخبر انسان یہی سمجھتے ہیں۔

دوسری دلیل (۴)

وہ حد کم ظرف ہیں جو ایک ساغر میں بہکتے ہیں (آتش)

ارشاد ہوتا ہے کہ "حد۔ کم ظرف" دلّی کا محاورہ ہے۔ لکھنؤ میں حد کے کم ظرف کہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ نہ دلّی کا محاورہ ہے نہ لکھنؤ کا۔ حد کم ظرف کا جزو نہیں بلکہ بڑے بہت۔ حد کے۔ حد درجہ کے۔ انتہائی انتہا درجہ کے فقرے لگائے جاتے ہیں۔ جب کسی میں کوئی صفت بہت زیادہ ظاہر کرنا ہوتی ہے۔ جیسے وہ حد درجہ کے نافہم ہیں۔

وہ حد درجہ کے نالائق ہیں۔ وہ حد درجہ کے بخیل ہیں۔ وہ حد درجہ کے بزدل ہیں۔ وہ حد درجہ کے بد دماغ ہیں۔ وہ بڑے سخی ہیں وہ بہت بہادر ہیں۔ حد کے میں سے "کے" نکال دیا جائے تو روزمرہ باقی نہیں رہتا۔ اس مصرع میں آتش بھی حد کے ہی کہنا چاہتے تھے مگر بحر میں سمائی نہیں تھی۔ اور قرینہ مطلب ادا کر رہا تھا۔ اس لئے اُنہوں نے صرف حد ہی نظم کر دیا ایسی مثالیں اس زمانے کے شعراء کے یہاں بکثرت ملیں گی۔

غالب کہتے ہیں ؎

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

بات کرنا نہیں آتی روزمرہ نہیں ہے بلکہ بات کرنا محاورہ۔ اب اس کے آگے چاہے نہیں آتی ہے لگا دیجئے۔ یا آتی ہے کہہ دیجئے۔ اس صورت میں بات کرنا رہ گیا۔ اور یہی اصل محاورہ ہے کسی کا دماغ تو خراب ہے نہیں جو بات کرنا کے محل پر بات کر کہے۔ لیکن چونکہ قبل و بعد کی لفظوں سے مطلب ادا ہو گیا۔ اس لئے شاعر نے اسی پر اکتفا کی ایسے محذوفات اُس زمانہ میں جائز تھے۔

۴۔ مُضحک دلیل

فاضل مقالہ نگار فرماتے ہیں کہ مندرجہ ذیل شعر میں خود آتش نے اپنا تعلق دہلی سے ظاہر کیا ہے ؎

اک تختِ ہفت کشور دلّی کا ہے ہماری
نو آسماں ہیں اپنے اکبر کے نورتن میں

اس شعر میں اکبر اعظم نہیں بلکہ اکبر شاہ ثانی کا ذکر ہے۔ اکبر اعظم کے نورتن مشہور تھے دوسرے مصرع میں اپنے کا تعلق معنی شعراور ہم عصری کو ظاہر کرتا ہے۔ خواجہ گو لکھنؤ میں تھے مگر دہلی کی "یاد دل سے بھولی نہ تھی" جا بجا شعروں میں یادِ وطن موجود ہے ؎

زمانہ میں کوئی غربت زدہ نہیں مجھ سا
اُڑی نہ اپنی کبھی جانبِ وطن مٹی

یہ نکتہ آفرینیاں اُن بزرگ کی ہیں جن کے تعارف میں وسیع النظر۔ مصنف۔

ادیب۔ صاحبِ ذوق۔ کُہنہ مشق شاعر ایسے گراں قدر الفاظ صرف کیے گئے ہیں۔ اس شعر میں اگر دہلی سے مراد دہلی ہے تو ہفت کشور اُس کا ایک تختہ بے معنی بات ہے۔ اسی طرح میرے اکبر سے اگر اکبر ثانی مراد ہیں تو نورتن اُن کے نو آسمان ہیں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہاں دہلی سے مراد ملکِ سخن ہے اور ہفت کشور اُس کا ایک تختہ ہے اِس سے ملکِ سخن کی وسعت مراد ہے جس کو عارف صاحب نے یوں کہا ہے۔

ع گردوں ہے سفینہ مرے دریائے سخن کا

میر انیس فرماتے ہیں:۔

ع سرجا ہے ملکِ نظم میں نظم و نسق مرا

دوسرے مصرعے میں اکبر سے فکرِ سخن مراد ہے اور آسمان اُسکے نورتن ہیں یعنی عالم بالا سے مضامین کے الہام و القا مراد ہے۔ اس بات کو شعرا نے مختلف طرح سے کہا ہے۔

ع آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

ع ہم آسمان سے لاتے ہیں اِن زمینوں کو

اور یہی مطلب اِس مصرعے کا ہے۔

ع شاعری جزویست از پیغمبری

اِسی کو آتش نے کہا ہے کہ ہمارے اکبر کے نورتن نو آسمان ہیں۔

فاضل مقالہ نگار نے جو معنی لکھے ہیں اس سے شعر کا کوئی ماحصل نہیں رہ جاتا۔

دوسرے شعر کا مطلب بھی ایسا ہی مضحک ہے۔ غربت کی شکایت اور وطن کی محبت کے مضمون سب ہی نے باندھے ہیں۔ ذوق و مومن نے جو ایسے مضمون لکھے ہیں ان میں کس وطن کی جدائی کا رونا روئے ہیں۔ اگر ایسی باتیں شاعر کی آپ بیتی سمجھی جایا کریں تو مے و میخانہ، صراحی و پیمانہ کا ذکر بڑے بڑے خداوندانِ تقویٰ کو تر دامن بنا دے۔

اور چمن کی داستان آشیانہ پر بجلی کا گمان۔ صیاد کا کھٹکا، باغبان کا دھڑکا، دام میں صید اور قفس میں قید کے مضمون شاعر کو آدمی سے جانور بنا دیں۔ سے

اندر گفتن گرچہ در سُفتن بود   لیک فہمیدن بہ از گفتن بود

انکشافِ راز

آخر میں اتنا اور سُن لیجیے کہ ہمارے محترم مقالہ نگار نے لکھنؤ کی زبان کی برائی میں جو لب کشائی فرمائی اُس میں کوئی خاص مصلحت ہے ورنہ وہ خود اُس کو برا نہیں سمجھتے۔ بلکہ اس کی تقلید کرتے ہیں۔ اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ جن لفظوں اور محاوروں میں دہلی اور لکھنؤ میں اختلاف ہے ان میں سے اپنے مضمون میں اکثر لکھنؤ ہی کے محاوروں کو اختیار کیا ہے۔ لیکن یہ فعل اضطراری اور غیر شعوری بھی کہا جاسکتا ہے۔

دوسرا ثبوت یہ ہے کہ موصوف نے اپنی ایک نظم (پرندوں میں جذبۂ وطن) جو انگریزی شاعر کیمبل کی نظم (اسپینی طوطا) کا اردو ترجمہ ہے۔ رسالہ معصر میں بغرض اشاعت بھیجی تھی۔ اس نظم کے ساتھ ایک تمہید بھی ہے اس میں تحریر فرماتے ہیں:۔

”دھن تھی کہ جہاں تک ہو سکے انگریزی کے خیالات اور جذبات کی پوری تصویر اردو میں اُتر آئے اور ترجمہ بھی لفظی ہو۔ مگر یہ بھی لحاظ تھا کہ اردو کی لطافت ہاتھ سے نہ جانے پائے اور جو سبق دہلی اور لکھنؤ کے باکمالوں نے سکھائے ہیں وہ بھولنے نہ پائیں۔

موصوف کے اس بیان سے کیونکر سمجھا جائے کہ ان کو لکھنؤ میں کوئی باکمال دکھائی نہیں دیتا۔

خاتمۂ کلام اور لسانی اغلاط

آخر میں فاضل مقالہ نگار کی زبان کی بھی چند غلطیاں سُن لیجیے۔ اگر طول کا خوف قلم کی راہ نہ روکتا تو

تو عبارت کی ناہمواری اور قلم کی بے راہ روی پر بہت کچھ لکھتا۔

قسط ۱ کالم ۱ سطر ۱ میں تحریر فرماتے ہیں :-

بعض پیچیدگیوں کی گتھیاں بھی کھول دی جائیں۔

پیچیدگیوں کی گتھیاں شب لیلۃ القدر کی رات سے کم قابل قدر نہیں۔

زیر نظر مضمون سے پہلے فاضل مقالہ نگار کا ایک خط ان کی مرضی کے خلاف ان کے ایک عزیز نے اخبار میں چھپوا دیا تھا۔ یہ بتانے کے لئے موصوف قسط ۱ کالم ۱ سطر ۲ میں تحریر فرماتے ہیں۔

مجھے اس کا ارادہ نہ تھا کہ یہ تحریر نمود عام پر لائی جائے۔

اس عبارت میں مجھے کی جگہ میرا اور اس کا کی جگہ یہ ہونا چاہیے۔ ارادہ کی لفظ بھی غلط ہے۔ اس لئے کہ اس کا نمود عام پر لانا خود ان کا فعل نہیں ہے "نمود عام پر لانا" بھی محل نظر ہے۔ اس موقع پر یوں لکھنا چاہیے تھا۔

"میرا یہ منشا نہ تھا کہ یہ تحریر شایع کر دی جائے۔"

قسط ۱ کالم ۲ سطر ۲۳

"تمام طبیعتیں ایک نکتہ پر بہم نہیں ہو سکتیں"

"بہم" کی جگہ جمع ہونا چاہیے۔ اُردو کے محاورے میں بہم ہونا اور بہم پہنچنا کے معنی ہیں میسر ہونا اور میسر آنا۔

قسط ۱ کالم ۲ سطر ۴۹ :- کرم فرما منتقد۔

منتقد غلط ہے۔ ناقد ہونا چاہیے۔

قسط ۱ کالم ۳ سطر ۵۱ وطن کی یاد دل سے بھولی نہ تھی۔ یاد بھولنا محاورہ نہیں وطن کی یاد دل سے نکلی نہ تھی ہونا چاہیے۔

قسط ۲ کالم ۲ سطر ۴۶ :- غلط العوام فصیح

عوام کی غلطی کو کسی نے فصاحت کی سند نہیں دی۔ غلط العام فصیح کہا گیا ہے (مولوف) نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک عام و عوام میں کوئی فرق نہیں۔

دہلی کے محاورے میں مارنا بمعنی رکھ لینا موجود ہے ؂

نیمچہ یار نے جس نے وقت بغل میں مارا جو چڑھا منھ اُسے میدان اجل میں مارا

مارنا کے معنی رکھ لینا نہ مروج تھا نہ ہے "بغل میں مارنا" ایک مخصوص محاورہ ہے جس کے معنی ہیں بغل میں دبانا۔ اگر مارنا کے معنی رکھ لینا ہیں تو دوسرے مصرع میں بھی مارنا کے معنی رکھ لینا ہونا چاہیے۔ اسی طرح تلوار مارنا، چھری مارنا، کٹاری مارنا، آنکھ مارنا، داؤں مارنا، ہاتھ مارنا، پتھر مارنا کے معنی تلوار میں رکھ لینا، چھری میں رکھ لینا، آنکھ میں رکھ لینا، داؤں میں رکھ لینا، ہاتھ میں رکھ لینا، پتھر میں رکھ لینا ہونا چاہیے۔

قسط ۵ کالم ۳ سطر ۵

"میرے ایک کرم فرما عمائدین لکھنؤ میں سے تھے"

عمائدین غلط ہے عمائد ہونا چاہیے۔

قسط ۶ کالم ۳ سطر ۲۲

"اس میں ڈھیل ڈھال اور بے پروائی سب نے برتی اور آپا دھاپی سے کام لیا"

"ڈھیل ڈھال" اور "آپا دھاپی" کے معنوں میں تضاد ہے۔ دونوں کا محل صرف ایک نہیں ہو سکتا "ڈھیل ڈھال" کے معنی غفلت بے پروائی ہے اور "آپا دھاپی" کے معنی ہیں اپنی ہی بھلائی چاہنا، دوسرے پر سبقت لے جانا، جلدی کرنا۔ ان معنوں میں کوئی معنی یہاں مناسب نہیں۔

قسط ۷ کالم ۲ سطر ۱ : اس کا اندازہ معلوم ہوتا ہے۔

اندازہ معلوم ہونا روزمرہ کے خلاف ہے۔ "اندازہ ہونا روزمرہ ہے"

قسط ۷ کالم ۳ سطر ۲۱

اگر ہم اُن مندی ہوئی کوٹھریوں میں جگمگاتے ہوئے دھن دولت کو

ڈھونڈھ نکالیں اور ان میں سے انمول رتن. جوڑیں تو ہماری بھاکا کا
آنچل ڈھلکتے ہوئے موتیوں سے بھرا پُرا دکھائی دے گا۔

کوٹھریوں میں کے بدلے کوٹھریوں سے ہونا چاہئیے۔ جگنائے ہوئے غلط ہے
اہل زبان جگنو کے رکھنا بولتے ہیں۔ یعنی کوٹھریوں میں جگنو کے رکھے ہوئے ڈھیر ہونا چاہئیے تھا۔
ڈھلکتے ہوئے موتیوں غالباً گوہر غلطاں کا ترجمہ کیا ہے لیکن یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے
غلطاں ہونا موتی کی گولائی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس طرح یہ فارسی ترکیب مجاز مرسل کی ایک
مثال ہے کہ مسبب کہہ کے سبب مراد لیا ہے۔ یعنی غلطاں کہہ کے موتی کی گولائی مراد
لی ہے۔ کثرت استعمال سے غلطاں کا لفظ سنتے ہی موتی کے گول ہونے کی طرف ذہن
منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیت ڈھلکتے موتی کے فقرے میں نہیں ہے اور غرابت صاف
ظاہر ہے۔ قسط ع۹ کالم ع۲ سطر ع۱۲

یہ شیخ علی حزیں کے تربیت یافتہ نے جو مشکل سے کسی کو آنکھ لگاتا تھا۔
آنکھ لگانا کے معنی ہیں غیر سے عشق محبت یا آشنائی کرنا۔ اسی بنا پر وہ عورت
جو ناجائز طور پر آشنائی سے ملی ہو آنکھ لگی کہی جاتی ہے۔ اس محل پر آنکھ میں
سمانا ہونا چاہئیے۔ یعنی شیخ علی حزیں کے فیض یافتہ نے جس کی آنکھ میں مشکل سے کوئی سماتا تھا۔
قسط ع۱ کالم ع۳ سطر ع۵ :۔ ملک میں وہ رائج ہو رہی ہے۔
رائج غلط ہے۔ مروّج ہو رہی ہے یا ترویج پا رہی ہے ہونا چاہئیے۔ یہ لفظ اس جگہ استعمال ہوا ہے اور جگہ غلط
زور بازو کی ضرورت ہے کوئی کھیل نہیں   کھینچ لے ہر کس و ناکس جو کمان اردو

فقط
والسلام

ذرۂ ناچیز :۔
محمد باقر شمس
جنوری ۱۹۳۷ء

(۱)

فہرست مضامین